کے مجموعہ "ادبی نقوش" میں شامل ہے۔

میگزین فضل الرحمٰن مرتبہ ڈاکٹر محمد تشکیل احمد صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و
اسلامیہ انٹر کالج بریلی طباعت دیدہ زیب سرورق، صفحات ۱۱۴، قیمت تحریر نہیں،
پتہ: فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج، بریلی،

غالب صدی کے موقع پر مختلف کالجوں نے بھی غالب نمبر نکالے ہیں یہ نمبر بریلی کے اسلامیہ انٹر کالج کا ہے، جو ترتیب، مضامین کے تنوع اور معیار کے اعتبار سے بعض رسالوں کے غالب نمبروں سے بڑھا ہوا ہے، کالج کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ بیرونی اصحاب قلم میں مولانا عرشی ضیاء احمد صاحب بدایونی اور خواجہ احمد صاحب فاروقی اور متعدد متعارف و غیر متعارف اہل قلم کے مضامین ہیں، ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مضمون محققانہ و معلومات افزا، اور احمد جمال پاشا کا مزاحیہ مضمون بھی دلچسپ ہے، بعض مضامین میں غالب کی مشکل پسندی اور غزل میں عدم تسلسل وغیرہ کا جواب دیا گیا ہے، نظم کا حصہ بھی خاصہ متنوع ہے، اس میں حالی کے عہد سے لیکر موجودہ دور کے شاعروں نے غالب کی عظمت کے اعتراف کے بارہ میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نقل کیا گیا ہے، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی غالب کے اشعار کا اودھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں، اس نمبر میں اشعار کا اودھی ترجمہ بھی شامل ہے، آخر میں ہندی میں بھی غالب پر چند مضامین ہیں، جابجا غالب کے متفرق اقوال اور تحریریں بھی دی گئی ہیں، جو ادبی و لسانی حیثیت سے بصیرت افروز ہیں، غرض یہ نمبر محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اور غالب پر نکلنے والے اچھے نمبروں میں شمار ہونے کے لائق ہے،

"ض"

جلد ۱۰۶ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

۱۵ اگست ۹ بجے دن کو بعض دوستوں نے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے حوالہ سے یہ خبر سنائی کہ صدر جمہوریہ نے ایک خادم علم کو عربی کی سند کا اعزاز عطا کیا ہے، پہلے سے اسکا کوئی تصور ذہن میں نہ تھا، اس لیے اس کے یقین کرنے میں تامل ہوا، پھر مسلسل خبریں ملیں اور سہ پہر کو مسز اندرا گاندھی اور ہوم سکریٹری کے تار سے اسکی تصدیق ہوئی، اس وقت پورا یقین ہوا، دوسرے دن اخبارات میں خبر آگئی، ایک ایسے گوشہ نشین کی جس کا سیاسی و پبلک زندگی اور کسی سرکاری ادارے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، یہ عزت افزائی حکومت ہند کی خالص علم نوازی کا ثبوت ہے، اور ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک علمی ادارے کی عزت افزائی ہے جس کے لیے دار المصنفین حکومت ہند کا شکر گذار ہے، اس اعزاز پر اعظم گڈھ کے مخلصین اور باہر کے احباب اور اہل علم نے جس اخلاص و محبت کا اظہار کیا ہے، راقم ان سب کا شکر گذار ہے، حتی الامکان فرداً فرداً ان سب کے تہنیتی خطوط کے جواب دیے ہیں، اگر کسی صاحب کو نہ ملا ہو تو ان کا ان سطور کے ذریعہ پھر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کی ایک بدبختی یہ بھی ہے کہ ان کے ہر جماعتی کام میں سیاست ضرور شامل ہو جاتی ہے، اور ایک ہی کام کے لیے کئی کئی تنظیمیں بنجاتی ہیں، تعمیری کاموں کے لیے تو الگ الگ تنظیمیں مفید بلکہ ضروری ہیں لیکن اس کے لیے بڑے اخلاص اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسکا صلہ جاہ و اقتدار کی شکل میں کم ملتا ہے اسلیے اسکی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے اور قسمت آزمائی کا سارا زور سیاست کے میدان میں صرف ہوتا ہے جسمیں مسلمانوں کی نمایندگی کے دعوے اور جاہ و اقتدار کے حصول کے لیے کشمکش ہونا ناگزیر ہے، اس سے مسلمانوں میں اختلاف و تشتت

پیدا ہو جاتا ہے۔ ... مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے لیے مسلم مجلس پہلے سے موجود ہے، اسکی موجودگی میں اس صوبہ میں مسلم لیگ کے پھیلنے سے مسلمانوں کو نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، شمالی ہند کا جنوبی ہند پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، جنوبی ہند میں فرقہ پروری کا اثر کم ہے اور شمالی ہند خصوصاً اترپردیش اور بہار اس کا گڑھ ہیں، نام کی قطعاً ضرورت نہ تھی، اس کے ساتھ یہ پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے، لیگ کے پیچھے ایک نہایت تلخ اور ناگوار تاریخ ہے جسکو اکثریت بھولی نہیں ہے، اس نام کے ساتھ یہ پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس لیے مسلم لیگ کو کسی قالب میں بھی زندہ کیا جائے، اکثریت کا معقول اور انصاف پسند طبقہ بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا، اور فرقہ پرور پارٹیاں تو اس سے بہت غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی، پھر خود مسلم لیگ اور مسلم مجلس میں اختلاف شروع ہو گا، اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان پہنچیگا، اس لیے شمالی ہند میں مسلم لیگ کا قیام مسلمانوں کے لیے سراسر مضر ہے۔

چند دن ہوئے انسانی برادری کا کتابچہ ہمارے پاس بھی آیا تھا، گذشتہ مہینہ دلی میں اسکا کنونشن ہوا جس میں ملک کے مختلف حصوں کے کئی سو نمایندے شریک ہوئے، اس کنونشن میں اسکا باقاعدہ قیام عمل میں آگیا ہے، یہ تنظیم خان عبد الغفار خاں کی قائم کردہ خدائی خدمت گار کی وسیع شکل ہے، اس کے مقاصد سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، فرقہ پروری کو ختم اور بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے جتنی کوششیں بھی کیجائیں مفید ہی ہیں، لیکن اصل سوال عمل کا ہے، قومی یکجہتی کونسل بڑے زور شور سے قائم ہوئی لیکن آجتک اسکا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اصل میں فرقہ پروری کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ ملک کا کوئی طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہے، اس لیے افراد کو چھوڑ کر کسی جماعت میں بھی کھل کر اس کی مخالفت کی ہمت اور اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اسی لیے اتحاد و یکجہتی کی کوئی تحریک بھی کامیاب نہیں ہوتی۔

فرقہ پروری کا مقابلہ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب حکومت اور پبلک دونوں اپنے اپنے

حلقہ میں اسکے دور کرنے کی پوری جد وجہد کریں، حکومت فرقہ پرور جماعتوں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھے اور انکے لیڈروں اور اخبارات کی تقریروں اور تحریروں کا محاسبہ کرے، تعلیم کے ذریعہ جو زہر پھیلایا جا رہا ہو اسکو روکے، فرقہ پرور حکام پر کڑی نظر رکھے، جن کی فرقہ پروری ثابت ہو جائے انکو پوری سزا دیجائے، اس قسم کے اور جو کام حکومت کے کرنے کے ہیں، ان کو حکومت انجام دے، کانگریس اور دوسری سیکولر پارٹیاں آل انڈیا پیمانہ پر فرقہ پروری کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، گاؤں گاؤں میں اتحاد و یکجہتی کا پیام پہنچائیں، فرقہ پرور جماعتوں نے مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں، انکو دور کریں اور اس راہ میں اپنی مقبولیت اور جاہ اقتدار سب کی بازی لگا دیں، اس وقت کچھ کامیابی کی امید ہو سکتی ہے، محض وعظ و پند سے فرقہ پروری کا زہر دور نہیں ہو سکتا اور اب یہ منزل آگئی ہے کہ یا فرقہ پروری کا مقابلہ کرکے اس کو ختم کیا جائے یا سیکولرزم اور جمہوریت کو خیرباد کہا جائے، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد حکومت ہند کی سرپرستی میں بدستور اپنے کاموں میں مصروف ہے، بلکہ پہلے کے مقابلہ میں اسکا کام بڑھ گیا ہے، چنانچہ ادھر چند برسوں کے اندر اس نے جتنی اہم اور مفید کتابیں شائع کی ہیں اتنی مدت میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوئیں، دائرۃ المعارف اپنی مطبوعات دارالمصنفین کو ہدیۃً بھیجتا ہے، اس سے پہلے جو کتابیں آئی تھیں اہل علم کی آگاہی کیلئے معارف میں انکا ذکر کیا گیا تھا، اب اس نے حسب ذیل مطبوعات بھیجی ہیں (۱) انباء الغمر فی انباء العمر ابن حجر عسقلانی جلد اول و دوم (۲) کتاب الحاوی زکریا رازی کی بیسویں اور اکیسویں جلد (۳) کتاب الالمام محمد بن قاسم نویری، پہلی دوسری جلد (۴) نظم الدرر ابراہیم بن عمر بقاعی، جلد اول (۵) کنز العمال شیخ علی متقی، پندرہویں سولہویں جلد (۶) کتاب الاصل امام محمد جلد دوم۔ ان میں سے بعض کتابیں غیر مرتب چھپ رہی ہیں اور بعض کی پہلی جلدیں اس سے پہلے آچکی ہیں، دارالمصنفین اس قیمتی ہدیہ کے لیے دائرۃ المعارف کے کارکنوں کا شکر گذار ہے۔

مقالات

تصوّف اور اس کے مسائل

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)، سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ

تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

منجملہ ان مسائل کے جو اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ دارالمصنفین میں حاضرین کے سامنے آئے، ایک تصوف کا مسئلہ بھی تھا، ہمارے محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا مقالہ جو وحدت الوجود پر یا اس کے کسی خاص پہلو پر تھا، وقت کی قلت کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا، لیکن فاضل معاصر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنے مقالہ میں ضمنی طور پر تصوف کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "ہندوستان میں اسلام آیا، تو جن چیزوں سے اس کو نقصان پہنچا، ان میں ایک تصوف بھی ہے"۔ اس پر بعض اصحاب معترض ہوئے، اور مولانا نے فراخدلی سے اپنی رائے میں ترمیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

اگر میں مولانائے ممدوح کے بیان کو صحیح طور پر سمجھا ہوں تو اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان میں ورود اسلام کے بعد یہاں تصوف پیدا ہوا، اور وہ اسلام کے لیے نقصان یعنی ضعف کا باعث ہوا، دوسری بات جو ضمنی طور پر ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ ان کی رائے میں تصوف بنفسہٖ ایک ایسی تحریک ہے جو سقیم ہے، اور اسلام کیلئے

نقصان دہ ثابت ہوئی ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غور طلب ہیں، بہرحال مسئلہ کو جس صورت میں پیش کیا گیا، اس میں قدرے الجھن ہے۔ اسی لیے بعض حاضرین کو اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانائے موصوف کے مفہوم کو سمجھنے میں اگر میں نے غلطی کھائی ہے تو میں ان کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں اور اپنے قصور فہم کا اعتراف کرتا ہوں، بہرحال میرے نزدیک اس مسئلہ کی جو صحیح صورت ہے، اس کو سطور ذیل میں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں،

حضرت انسان نے کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی جو مسلسل کوشش کی ہے، اس کوشش کے نتائج نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں کئی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، مثلاً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ تمام اسی کوشش اور جستجو کی بدولت معرض وجود میں آئے ہیں، سامی اقوام کے مذاہب میں نوع انسان کا ارشاد و ہدایت، وحی اور رسالت (Revelation Through Prophets) کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے، درحالیکہ آریائی قوموں کے ہاں عامۃ الناس اوتار (Incarnation) کے واسطہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اہل چین کا مذہب بیشتر ضابطۂ اخلاق کا نام ہے جو الٰہیات (Theology) کے مسائل سے بہت کم سروکار رکھتا ہے، اہل مذاہب کے علاوہ فلاسفہ کا ایک گروہ ہے جو کائنات کے عقدہ کو اپنی عقل (Reason) کے ناخن سے کھولنے کی سعی کرتا ہے،

مذہب (Religion) اور فلسفہ (Philosophy) کے علاوہ اسی سلسلہ کا ایک اور "طرز خیال یا انداز فکر" ہے، جسے انگریزی میں mysticism کہتے ہیں، یہ متصوفانہ انداز فکر بھی تقریباً تمام ملتوں اور تمام ملکوں میں پایا جاتا ہے، اسکا

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ mystic یعنی عارف اپنے ذاتی وجدان (Intuition) سے حقائق کا علم حاصل کرتا ہے، اس کے انداز خیال میں روحانیت کا غلبہ رہتا ہے اور اس کے گھر کی رونق بیشتر اس کے جذبات کے خروش پر موقوف ہے۔

عالم اسلام بھی mysticism کی تحریک سے خالی نہیں رہا، اسلامی mysticism کو اصطلاحاً تصوف کہتے ہیں (تصوف کی لغوی تشریح اس مضمون کے آئندہ حصہ میں آئے گی)۔ تصوف کے ارتقاء کی ایک خاصی لمبی اور گوناگوں تاریخ ہے، جس کے دوران میں صوفیہ کے حالات اور ان کی تصنیفات کے علاوہ بہت سے اہم اعتقادی مسائل زیر بحث آتے ہیں، اور ان کی تفسیر و تشریح کے علاوہ ان کے ماخذ و مصادر کی تلاش ہوتی ہے، اہل اسلام کی مذہبی زندگی میں تصوف کو جو نمایاں مقام حاصل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کا مطالعہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ضمن میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اگرچہ محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ سے اسلام کے قدم ہندوستان میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پہنچ چکے تھے، اور سندھ کے بعض حکمرانوں اور بعض عوام نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن مرکز خلافت کی کمزوری یا عدم توجہ سے اسلام کا قدم سندھ اور ملتان سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خاص ہندوستان میں اسلام کی عام اشاعت اس وقت سے شروع ہوئی جب غزنوی خاندان کے عہد میں پنجاب کا غزنوی سلطنت کے ساتھ الحاق ہوا، اور لاہور میں شیخ اسمٰعیل لاہوریؒ اور شیخ علی ہجویریؒ نے ایک ناسازگار ماحول میں اسلام کی تبلیغ شروع کی اور یہ زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے،

اس زمانہ میں ہندوستان میں جو mystic (یعنی متصوفانہ) تحریک قدیم الایام سے رائج چلی آرہی تھی، وہ ویدانت ہی کی ایک شاخ تھی، جہاں تک تصوف کا تعلق ہے

وہ ہندوستان میں اسلام کے ہمراہ قدم بقدم آیا۔ چنانچہ شیخ علی ہجویریؒ مبلغ اسلام بھی تھے، اور ایک بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ ان کے عالی مرتبہ پر ان کی مشہور عالم تالیف کشف المحجوب شاہد عدل ہے، جو تصوف پر فارسی زبان میں سب سے پہلی جامع اور مستند تالیف تسلیم کیجاتی ہے، اشاعت اسلام کے راستہ کا دوسرا سنگ میل خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (متوفی ۶۳۳ھ) نے نصب کیا، جن کو صوفیہ کے چشتیہ طریقہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، اور جو اپنی ہمہ حال کامیابی اور اپنے وسیع اثر و رسوخ کے لحاظ سے ہندوستان کے مبلغین میں غالباً سب سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں، الغرض جب تصوف اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آیا، اس وقت نہ صرف یہ کہ عالم اسلام میں دوسری صدی ہجری میں تصوف زہد کی صورت میں پیدا ہو چکا تھا، بلکہ زہد کے مرحلہ سے گزر کر تھیاسوفی (Theosophy) کی منزل میں داخل ہو چکا تھا، اور اس کے علاوہ اس میں حلول، اتحاد اور ارواح انسانی کے انفصال (Emanation) و انجذاب کی قسم کے کئی ایک غیر اسلامی تصورات رونما ہو چکے تھے،

ہندوستان میں اسلام کو جو ضعف پہنچا ہے وہ بیشتر یہاں کی قدیم مشرکانہ رسوم و توہمات کے استمرار اور بدعات کے ظہور سے پہنچا ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے:

سطوت اسلام قائم جن نمازوں سے ہوئی — وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے وہ بھی ہندوستان کے غیر اسلامی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، تصوف میں جو غیر اسلامی عناصر پہلے ہی سے موجود تھے، ان کو مقامی ماحول کے اثر سے مزید تقویت پہنچی اور انھوں نے ہندوستان کے صوفیہ کے ہاں خوب فروغ پایا، مثلاً ہندوستان تو پہلے ہی سے عقیدہ "ہمہ اوست" کا ایک قدیمی گڑھ چلا آرہا تھا، اس لیے اس

عقیدہ کے لیے یہاں کی فضا بڑی سازگار ثابت ہوئی اور اکثر مسلمان صوفیہ وحدت الوجود کے سیلاب میں بہہ نکلے، یہاں تک کہ اس کو روکنے کے لیے "وحدت الشہود" کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔

اہل اسلام کو تصوف سے نقصان پہنچا ہے یا فائدہ؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے اس بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ تصوف کسی خاص منظم عقیدہ یا فرقہ کا نام نہیں جس کی تعلیمات معین ہوں، اگرچہ متعدد صوفیہ مثلاً ابو القاسم قشیریؒ، شیخ علی ہجویری اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ اور کلاباذی نے اپنے اپنے زمانے میں اور اپنے اپنے انداز میں تصوف اور اس کے مسائل کی تشریح کی ہے، لیکن اس کے باوجود تصوف کے اصول اور صوفیہ کے مختلف نظریات اور تصورات کسی ایسی منظم صورت میں مدون نہ ہو سکے، جن پر تمام یا اکثر صوفیوں کا اتفاق ہو، تصوف دراصل محض ایک روحانی انداز فکر ہے، جس میں ظواہر دین کی بجائے مذہب کے روحانی اور اخلاقی پہلو پر زور دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ مختلف صوفیہ نے مختلف عقائد اور نظریات کو اہمیت دی ہے، صوفیوں کے ہاں کئی مختلف سلسلے ہیں، جن کے اپنے اپنے رجحانات اور خیالات ہیں، الغرض تصوف کے کئی رنگ ہیں اور وہ دوسری صدی ہجری سے لیکر آج تک یعنی گذشتہ تیرہ صدیوں میں ترقی و کمال اور اس کے بعد انحطاط و ابتذال کے کئی مختلف مراحل سے گزر چکا ہے، تصوف کا غیر معین ہونا اس امر سے بھی ثابت ہے، کہ بہت سے صوفیہ کرام تصوف کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن مجھے آج تک دو صوفی ایسے نظر نہیں آئے، جنھوں نے تصوف کی تعریف (Defintion) یکساں طور پر کی ہو، ان وجوہات سے تصوف کے متعلق کوئی ایسا حکم نہیں لگایا جا سکتا جس کا اطلاق تمام صوفیہ پر اور صوفیہ کے تمام سلسلوں پر اور تصوف کے تمام پہلوؤں پر یکساں طور پر ہو سکے۔

تصوف کے مفید یا مضر ہونے کا مسئلہ تصوف کی اس خاص صورت پر موقوف ہے جو محقق یا مبصر کے پیش نظر ہو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، تصوف کے کئی رنگ ہیں، اور مختلف اسلامی ملکوں میں اس کے کئی مختلف رجحانات اور مختلف خصوصیات نظر آتی ہیں،

اور جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے، تصوف کے بعض پہلو بڑے روشن اور درخشندہ ہیں، مثلاً تصوف نے اسلام کے روحانی پہلو پر زور دے کر تہذیب اخلاق کے سلسلہ میں بڑی بیش بہا خدمت سرانجام دی ہے، اس کے علاوہ بہت سے صوفیہ کرام نے مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور سیدی محمد بن علی سنوسی وغیرہم نے اپنی زندگی میں اور انکے بعد ان کے سلسلوں نے تبلیغ اسلام میں بڑی جانفشانی دکھائی ہے، اور ان کی مخلصانہ کوششوں سے اسلام نے دور دراز ملکوں میں اشاعت پائی ہے، علاوہ بریں جب کبھی مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، تصوف نے شکستہ دلوں کو سہارا دیا ہے اور ان کو یاس و قنوط سے بچایا ہے، اور اس طرح سے مسلمانوں کے بقاء کا سامان کیا ہے، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں عوام میں صوفیہ کے سلسلوں کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی، اس کی بیشتر وجہ یہی تھی کہ عامۃ الناس اس زمانہ کے سیاسی انتشار سے تنگ آکر اپنی روحانی تسکین کے لیے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھے، جن احباب کے سامنے تصوف کے مذکورۂ بالا روشن پہلو ہیں، وہ تصوف کو فیض رساں تصور کرنے میں حق بجانب ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کرنا لازم ہے کہ بعض صوفیہ کے ذریعہ سے بعض غیر اسلامی عقائد (مثلاً وحدت الوجود کا عقیدہ اور ارواح کا انفصال و انجذاب جو سراسر ویدانت ہے) مسلمانوں کے ہاں راہ پا گئے ہیں، اور اس قسم کے تصورات اور عقائد نے اس خاموشی سے سرایت کی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی، اور ان عقائد کا تسلط

اتنا زبردست ہے کہ بہت سے صوفیہ ان کو عین اسلام سمجھتے ہیں، غالباً تصوف کا یہی وہ افسوسناک پہلو ہے جو ہمارے بعض احباب کی نگاہ میں کھٹکتا ہے، اور میرے خیال میں بجا طور پر کھٹکتا ہے،

ان کے علاوہ تصوف میں بعض ایسے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں (مثلاً ترک دنیا، عزلت گزینی، حجرہ نشینی، نفس کشی، انکار کسب اور توکل کا غلط مفہوم) جن کو اگرچہ قطعی طور پر غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا، لیکن وہ کسی ایسی قوم کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے جو اس دنیا کی بین الاقوامی تگ و دو میں عزت و آبرو کے ساتھ باوقار زندگی بسر کرنا چاہتی ہے، مذکورۂ بالا رجحانات کے سبب سے زمانۂ حال کے اکثر حلقوں میں صوفیہ کے بارے میں خاصی بدظنی پائی جاتی ہے، چنانچہ اقبال نے کسی زمانہ میں صوفیوں کی جو مذمت کی تھی، وہ بھی اسی بنا پر تھی کہ صوفیہ کے بعض حلقوں میں ترک دنیا اور گریز کی طرف جو میلان پایا جاتا ہے، وہ اسے جمود اور بے عملی کا مترادف سمجھتے تھے، اور اسے قوم کے حق میں نقصان دہ خیال کرتے تھے،

میں ذاتی طور پر اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ بعض نیک نفس اور پاک طینت بزرگوں نے اگر وقتی طور پر گوشہ گیری اختیار کی تھی تو اس کی بیشتر وجہ یہ تھی کہ وہ دلجمعی کے ساتھ یاد الٰہی میں مشغول ہونا چاہتے تھے،

ڈاکٹر اقبال نے اپنی رائے کے اظہار کے موقع پر بدقسمتی سے ایک غلط مثال کا انتخاب کیا تھا، یعنی اس سلسلہ میں خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو مورد طعن بنایا تھا، جس سے تمام ارباب ذوق کو بےحد دکھ پہنچا تھا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو فراموش کر دیا تھا کہ خواجہ حافظ کوئی بے کار قسم کے گوشہ گیر صوفی نہ تھے، بلکہ وہ حفظ قرآن کے بعد تمام عمر پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہے، اور ان کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی میں اپنا کلام بھی جمع نہ کر سکے۔

وہ کلام معجز نظام جس نے ان کی حین حیات ہی میں عالمگیر شہرت حاصل کرلی تھی، بمصداق

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ — بیا کہ نوبتِ بغداد و وقت تبریز است

جیسا کہ ناظرین کرام خوب جانتے ہیں، خواجہ حافظ کا کلام ان کی وفات کے بعد ان کے ایک قدر شناس محمد گل اندام نے جمع کیا تھا، چنانچہ جامع دیوان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"لے محافظتِ درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیہ کشاف و مصباح و مطالعہ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و دواوین عرب از جمع ابیات و غزلیاتش انعامے داز تدوین و اثبات ابیاتش وازع گشتہ۔"

چوں شعر عذب روانش ز بر کنی گوئی — ہزار رحمتِ حق بر روانِ حافظ باد

آجکل تصوف کے متعلق جو عام بدگمانی پائی جاتی ہے، اس کے بعض اسباب کی طرف اشارہ کر چکا ہوں لیکن ان کے علاوہ کچھ اسباب اور بھی ہیں، مثلاً

(۱) صوفیوں کے شطحات اور مجذوبوں کی بڑیں۔

(۲) صوفیہ کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں بالعموم کرامات کی بھرمار ہوتی ہے، لیکن موجودہ زمانے کا مزاج اس قدر بدل چکا ہے کہ آجکل کا ذہن ان خوارق عادات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، اور بجائے اس کے کہ پڑھنے والا ان کرامات سے اچھا اثر قبول کرے وہ الٹا صوفیہ کے خوش عقیدہ مریدوں سے بدظن ہو جاتا ہے، اور ان کو توہم پرست سمجھتا ہے۔

(۳) تصوف کی بعض کتابوں میں کمزور بلکہ موضوع حدیثوں سے کام لیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے روایات کے پرکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی، اس سے یہ لازمی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا بیان اور استدلال خود بخود کمزور ہو جاتا ہے۔

(۴) بعض مکار اور ریاکار لوگ بافراط صوفیوں کے حلقہ میں شامل ہو کر ان کی بدنامی کا باعث ہوئے ہیں، لیکن یہ شکایت تو خاصی پرانی ہے، چنانچہ خواجہ حافظ مدت ہوئی کہہ گئے ہیں،

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد — بنیاد مکر با فلکِ حقہ باز کرد

اے کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز — غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

(۵) مکار لوگوں کے علاوہ بے شرع صوفیوں اور قلندروں نے صوفیہ کی صفوں میں داخل ہو کر تصوف کے وقار کو سخت ٹھیس لگائی ہے، بلکہ تصوف کی لٹیا ہی ڈبو دی ہے، کیونکہ عام لوگ ان کو بھی تصوف کے نمائندے سمجھتے ہیں،

(۶) بعض صوفیوں نے حلاج جیسے انتہائی مشکوک کیرکٹر اور کردار کے شخص کو ولایت کا درجہ دے رکھا ہے، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جن صوفیہ کی اصابت رائے کا یہ حال ہو کہ وہ حلاج جیسے شخص کو ولی سمجھتے ہیں، ان کی باقی باتوں کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے،

(۷) ایک قوی سبب تنفر کا یہ بھی ہے کہ بعض صوفیہ کی وجہ سے غیر اسلامی عقائد اور تصورات مسلمانوں کے ہاں رائج ہو گئے ہیں، اس لیے بعض احباب کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ تصوف نے کسی زمانہ میں کوئی مفید خدمت انجام دی ہو لیکن تصوف بالآخر اسلام کے حق میں ایک چور دروازہ ثابت ہوا ہے، جس کے راستہ سے غیر اسلامی عناصر مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہو گئے ہیں، (ان عناصر کی تفصیل و تشریح مضمون کی آئندہ قسط میں کی جائے گی)

اصطلاحاتِ صوفیہ

تصوف کے مطالعہ کی چند ایک مشکلات ہیں، ان میں سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ صوفیۂ کرام کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ اپنے تصورات، خیالات اور وجدانی کیفیات کو ادا کرتے ہیں، اگرچہ یہ اصطلاحات بالعموم عربی زبان کے کلمات پر مشتمل ہیں، اور

ان میں سے متعدد الفاظ خود قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن صوفیہ ان الفاظ کو اپنے مخصوص معنوں میں استعمال کرتے ہیں، بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی اصطلاحی لفظ کی مختلف صوفیہ نے مختلف طور پر تشریح کی ہے، چونکہ صوفیہ کی اکثر اصطلاحات کا تعلق ذہنی تصورات اور وجدانی کیفیات سے ہے، اس لیے ان کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا یا متعین کرنا چنداں آسان کام نہیں ہے،

صوفیہ کی اصطلاحات کے بارے میں عربی زبان کی عام متداول لغاتیں مثلاً جمہرۃ ابن درید، صحاح جوہری، لسان العرب اور قاموس فیروز آبادی چنداں مفید نہیں ہیں، کیونکہ ان میں بیشتر زمانۂ جاہلیت یا صدر اسلام کی زبان سے سروکار رکھا گیا ہے، اور چونکہ ان کے مؤلفین کے نزدیک صرف جاہلی شعراء کی زبان ٹکسالی تھی، اس لیے انھوں نے لغوی شواہد بھی ان ہی کے کلام سے لیے ہیں، اس طریق تالیف کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جہانتک مسلمانوں کے تمدن اور ان کے علوم و فنون کا تعلق ہے، یہ لغاتیں اپنی وسعت اور ضخامت کے باوجود کفایت نہیں کرتیں، لہذا علمائے اسلام اس بات پر مجبور ہوئے کہ مختلف علوم و فنون کے متعلق خصوصی لغاتیں تیار کریں، چنانچہ قرآن پاک کے الفاظ کی تشریح کے لیے امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے المفردات فی غریب القرآن تالیف کی، اور کتب حدیث کے الفاظ کی شرح کے لیے ابو السعادات ابن الاثیر جزری (م ۶۰۶ھ) نے النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ایک وسیع پیمانہ پر تصنیف کی اور علم حدیث کی خاص اصطلاحات کو حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر میں جمع کیا اور بعد ازاں اس کی شرح بھی لکھی،

ان کے علاوہ محمد بن یوسف الکاتب الخوارزمی نے جب ۳۶۶ھ میں مفاتیح العلوم لکھی تو علوم قدیمہ اور جدیدہ کے موضوعات کی وضاحت کے علاوہ اکثر علوم کی خصوصی اصطلاحات

کی تشریح کی، مثلاً اس کے زمانے میں سرکاری دفتروں میں جو کلمات اصطلاحی حیثیت اختیار کر چکے تھے، ان کے معانی بتائے، اسی طرح فلسفہ اور موسیقی کے بیان میں ان علوم کی اصطلاحات پر بھی روشنی ڈالی۔ علاوہ بریں ہندوستان میں شیخ محمد علی تھانوی نے "کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم" کے نام سے ایک ضخیم اور نہایت مفید لغت تیار کی جس کا سنہ تالیف ۱۱۵۸ھ ہے۔

جہانتک تصوف کی اصطلاحات کا تعلق ہے عام ناظرین اور محققین دونوں کیلئے مندرجۂ ذیل کتابیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں:

(۱) کتاب التعریفات۔ تالیف السید الشریف الجرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) مطبوعۂ استنبول ۱۲۵۳ھ،
اگرچہ یہ کتاب تصوف کی اصطلاحات کے ساتھ مخصوص نہیں، تاہم اس میں صوفیہ کی بہت سی مصطلحات مل جاتی ہیں۔

(۲) رسالۃ فی بیان اصطلاحات ابن العربی الواردۃ فی الفتوحات۔
یہ رسالہ التعریفات الجرجانی کے اس اڈیشن کے ذیل میں شائع ہوا جو مطبعہ وہبیہ (مصر) میں طبع ہوا تھا،

(۳) شرح علی نصوص الحکم لمحی الدین بن العربی۔ تالیف کمال الدین عبد الرزاق کاشانی (متوفی ۷۵۱ھ) مطبوعۂ مصر ۱۳۰۹ھ۔

(۴) کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم۔ تالیف الشیخ محمد علی تھانوی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۸ء۔ یہ کتاب تصوف کی اصطلاحات کے لیے مخصوص نہیں، تاہم اس میں صوفیہ کی اکثر اصطلاحات کی شرح مل جاتی ہے،

مذکورۂ بالا مؤلفات کے علاوہ ذیل کی معروف کتابوں میں بھی صوفیہ کی بہت سی اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے، چونکہ یہ کتابیں بڑے بلند پایہ صوفیہ کے قلم سے نکلی ہیں، اس لیے ان کا پایۂ استناد بھی اسی نسبت سے بلند ہے۔ امید ہے کہ یہ نشاندہی ان احباب کے لیے مفید رہے گی، جو تصوف کا خصوصی مطالعہ کر رہے ہیں:-

(۱) کتاب اللمع فی التصوف تالیف الشیخ ابی النصر السراج الطوسی (متوفی ۳۷۸ھ)

بتصحیح ڈاکٹر نکلسن۔ مطبوعہ لائڈن ۱۹۱۴ء۔

اس کتاب میں ۳۴۱ مصطلحات کی شرح ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳۳ سے لیکر ۳۷۴ تک۔

(۲) الرسالۃ القشیریۃ (سنہ تالیف ۴۳۸ھ) تالیف ابی القاسم عبدالکریم قشیری (متوفی ۴۶۵ھ) طبع بولاق ۱۲۸۴ھ۔

مؤلف نے اس رسالہ کے ایک خاص باب میں ایک سو دو اصطلاحات کی تشریح کی ہے، اس باب کا عنوان یہ ہے: فی تفسیر الفاظ تدور بین هذه الطائفة۔

(۳) کشف المحجوب تالیف شیخ علی ہجویریؒ (پانچویں صدی ہجری)

اس کتاب کے آخری حصہ میں مؤلف نے ایک خاص باب (کشف الحجاب الحادی عشر) صوفیہ کی اصطلاحات کی تشریح کے لیے وقف کیا ہے، اور اس میں ایک سو چھ اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔

(۴) منازل السائرین الی الحق تالیف ابی اسمٰعیل الہروی (متوفی ۴۸۱ھ) مطبعۃ السادۃ ۱۳۲۷ھ۔

اس کتاب میں ایک سو مصطلحات کی شرح کی گئی ہے۔

عبدالرزاق کاشانی نے منازل السائرین کی شرح لکھی تھی، جو ۱۳۱۵ھ میں طبع ہو چکی ہے، اصطلاحات کے سلسلہ میں اس شرح کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے۔

(۵) امام غزالی نے بھی احیاء علوم الدین میں صوفیہ کی بہت سی اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔

(۶) عوارف المعارف (سنہ تالیف ۵۶۰ھ) تالیف شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ (متوفی ۶۳۲ھ) مطبوعہ مصر ۱۲۹۲ھ۔

اس معروف کتاب میں بھی صوفیہ کی بعض مصطلحات کی تشریح کی گئی ہے۔

اگر کوئی صاحب ہمت کریں تو مذکورہ بالا کتابوں کی مدد سے اور ان کے بیانات کے باہمی مقابلہ سے اردو میں اصطلاحات صوفیہ کی ایک جامع اور مستند لغت تیار ہو سکتی ہے، اور وہ کتب تصوف سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے ایک مفید اور قیمتی تحفہ ثابت ہو سکتی ہے۔

لفظ صوفی کی اصل کیا ہے

مولانا جامی رقمطراز ہیں کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں سب سے پہلے ابوہاشم کوفی صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے، ابوہاشم سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کے ہمعصر تھے، اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس لقب کی اصل کیا ہے؟ جو بزرگوں کی ایک خاص جماعت کیلئے استعمال ہوا اور جو ان کے لیے آج تک مروج چلا آرہا ہے، اس لفظ کی اصل کے بارے میں کئی اقوال منقول ہوئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ یونانی لفظ Sophos سے ماخوذ ہے جس کے معنی "دانشمند" ہیں، لیکن اس قول کی تائید میں کوئی مضبوط لسانی یا تاریخی دلیل پیش نہیں کی گئی، شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیا، کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد صوفیہ نے اسے "صفا" سے ماخوذ بتایا ہے، لیکن علم صرف اور لغوی قیاس کے اصولوں سے یہ اشتقاق درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ "صفا" اور "صوفی" کے اصلی مادے الگ الگ ہیں، ایک کا مادہ "صفو" ہے اور دوسرے کا "صوف"۔ تیسرا قول یہ ہے کہ صوفی صوف سے مشتق ہے جس کا معنی اون ہے، اور صوفیہ کے صوفی کہلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ لوگ از راہِ زہد و تقشف ریشم یا روئی یا کتان کے کپڑوں کی بجائے اونی لباس پہنتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے، علامہ ابن خلدون نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے، چنانچہ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ قلتُ والاظهرُ ان قیل بالاشتقاق انّه من الصّوف وهم فی الغالب مختصّون بلبسه لما

کانوا علیہ من مخالفۃ الناس فی لبس فاخر الثیاب الی لبس الصُّوف، یعنی

جہانتک لفظ صوفی کے اشتقاق کا تعلق ہے، میری رائے میں یہ لفظ غالباً صوف سے ماخوذ ہے، کیونکہ صوفیہ میں سے اکثر لوگ عوام کے برعکس لباس فاخرہ کی بجائے اونی کپڑے پہنتے تھے۔"

لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں مغربی علماء کے ہاں بھی ایک مدت سے بحث چلی آرہی تھی، آخر کار پروفیسر نولڈکے نے حسب معمول اپنی مخصوص ژرف نگاہی سے اس مسئلہ کی تحقیق کی اور اس کے لسانی، تاریخی اور عمرانی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے، انھوں نے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا کہ اسلام کی پہلی دو صدیوں میں عوام کے علاوہ خصوصاً زاہد اور پرہیزگار لوگ اونی کپڑے پہنتے تھے، چنانچہ قدیم کتابوں میں لَبِسَ الصُّوفَ کا جملہ اکثر آیا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ فلاں شخص ترک دنیا کر کے زاہد بن گیا ہے، اور بعد میں جب زہد نے تصوف کی صورت اختیار کر لی تو اس جملہ سے یہ مراد لینے لگے کہ فلاں شخص صوفی بن گیا ہے۔ اس رائے کی اس امر سے بھی تائید ہوتی ہے کہ فارسی زبان میں صوفی کو پشمینہ پوش کہا گیا ہے، شام کے عیسائی راہبوں میں کئی صدیوں سے اونی لباس مروج چلا آرہا تھا، اس لیے ان ملکوں کے مسلمان زاہدوں کا اونی لباس اختیار کرنا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے، پروفیسر نولڈکر کا یہ مقالہ جرمن اورینٹل سوسائٹی کے مجلہ کی ۴۸ ویں جلد مجریہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا، چنانچہ اس وقت سے مغربی علماء کے ہاں لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں پروفیسر موصوف ہی کا قول مقبول چلا آرہا ہے۔

صوفی کی جمع صوفیہ آتی ہے، چنانچہ امام قشیری اپنے رسالہ کے متعلق لکھتے ہیں:-

هٰذهِ الرِّسالةُ كتبها...... القشيريُّ الى جماعةِ الصوفيةِ ببُلدانِ الاسلام۔

صوفیہ کے طرز خیال اور طرز زندگی کا نام تصوف ہے۔

متصوف اور متصوفہ دونوں تصوف سے ماخوذ ہیں، اور صوفی اور صوفیہ کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔

تصوف کیا ہے؟

تصوف کیا ہے اور صوفی کون ہے؟ بجائے اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں، بہتر ہے کہ اس کا جواب خود صوفیۂ کرام کی زبان فیض ترجمان سے سنیے:-

۱۔ حضرت حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ "معرفت یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر تھوڑی سی بھی خصومت نہ پائے۔" یعنی عارف پورے طور پر راضی برضا ہو۔ آپ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ "فکر اور تقویٰ بہترین عمل ہیں۔"

۲۔ حضرت سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کا قول ہے کہ "عارف خدا سے مشغول ہو کر اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "ہمیں چاہیے کہ اللہ کو سب سے زیادہ دوست رکھیں۔"

۳۔ ابراہیم بن ادہم بلخی (متوفی ۱۶۱ھ) نے فرمایا کہ "عارف کی نشانی یہ ہے کہ اس کا دل سوچ بچار میں ڈوبا رہے، اس کی گفتگو خدا تعالیٰ کا ذکر ہو، اور اس کا بیشتر عمل خدا کی عبادت ہو، اور اس کی اکثر نظر اس کے لطائف قدرت اور عجائب صنعت پر رہے۔"

آپ کی مناجات یہ تھی "اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ آٹھوں بہشت اس سرفرازی کے مقابلہ میں جو تو نے مجھکو دی ہے اور تیری محبت اور ذکر و انس اور تیری عطا کردہ فراغت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔" اس مناجات کے علاوہ یہ دعا بھی اکثر اوقات ان کی زبان پر جاری رہتی تھی "اے خداوند کریم! عصیان اور نافرمانی کی شرم و ندامت سے اٹھا کر مجھے اپنی اطاعت کے شرف سے سرفراز کر۔"

۴۔ خواجہ ابو علی شقیق بلخی (متوفی ۱۷۴ھ) کا قول ہے کہ "سات سو عالموں سے پوچھا گیا

کہ خردمند کون ہے، تونگر کون ہے، زیرک کون ہے، درویش کون ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا "جو دنیا کو دوست نہ رکھے"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اصل طاعت خوف، رجا اور محبت ہے"۔

آپ کا ایک دیگر قول یوں منقول ہے کہ "طاعت کا $\frac{9}{10}$ حصہ خلقت سے دوری پر مشتمل ہے اور باقی ایک عشر سکوت اور خاموشی ہے"۔

خواجہ شقیق بلخی نے توکل علی اللہ پر خاص طور پر زور دیا ہے اور یہ عقیدہ ان کے تصوف کی خصوصیت ہے، آپ نے فرمایا کہ "متوکل کو رزق کے اکتساب کے لیے مطلق کوشش نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی کوئی پیشہ یا حرفہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کا واحد معاملہ خدا کے ساتھ ہے"۔

۵۔ حضرت رابعہ بصریہ (متوفیہ ۱۸۵ھ) کے اقوال سے ثابت ہے کہ ان کا تصوف سراسر حب اللہ پر مشتمل تھا، کسی نے ان سے پوچھا "کیا تمھیں خدا سے محبت ہے"؟ جواب دیا کہ "ہاں" پھر ان سے پوچھا گیا "کیا تمھیں شیطان سے نفرت ہے"؟ بولیں "مجھے خدا سے جو محبت ہے اس نے میرے دل میں شیطان سے عداوت کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی"۔ پھر بولیں کہ "میں نے رسول خداؐ کو خواب میں دیکھا، آنحضرتؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا" اے رابعہ! کیا تجھے مجھ سے محبت ہے"؟ میں نے عرض کی "یا رسول اللہ! وہ کونسا فرد بشر ہے جس کو آپ سے محبت نہیں! لیکن خدا کی محبت نے مجھے اس قدر مشغول کر رکھا ہے کہ کسی اور کی محبت یا نفرت کے لیے میرے دل میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی"۔

ڈاکٹر نکلسن کی رائے ہے کہ مسلمان صوفیہ میں تھیاسوفی یعنی حب اللہ کا دور رابعہ بصریہ ہی کی ذات سے اور اسی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔

۶۔ شیخ فضیل بن عیاض (متوفی ۱۸۷ھ) کا قول ہے کہ "دوستانِ خدا کو تین چیزیں ملی ہیں: حلاوت، ہیبت اور محبت"۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "میں نے خدا تعالیٰ کی عبادت دوستی کی بنا پر کی ہے"۔

۷۔ معروف کرخیؒ (متوفی ۲۰۰ھ) کا قول ہے کہ "تصوف سے مراد حقائق کا حاصل کرنا اور احوال خلائق کا چھوڑنا ہے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اولیا اللہ کی تین نشانیاں ہیں، ان کا تمام سوچ بچار اللہ کے لیے ہوتا ہے، ان کا تمام کاروبار اللہ کے ساتھ ہے، اور انکی ہجرت بھی اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے"۔

۸۔ ابوسلیمان عبدالرحمٰن دارانی (م ۲۱۵ھ) نے سب سے پہلے مسلمان صوفیہ میں معرفت یا عرفان (Gnosis) کے نظریہ کو رواج دیا اور اس کو طرح طرح سے بیان کیا، چنانچہ ان کا قول ہے کہ "دنیا کی ہوا و حرص کے دام سے وہی لوگ خلاصی پا سکتے ہیں جن کے دل میں عرفان کی روشنی ہے، یہ روشنی ان کو آخرت کے خیال میں مشغول رکھتی ہے"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے، تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے، اور وہ خدا کے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھتا"۔

۹۔ بشر بن حارث حافی (م ۲۲۷ھ) کا قول ہے کہ "صوفی وہ ہے جو اپنے دل کو خدا کے ساتھ صاف رکھے"۔

۱۰۔ ذوالنون مصریؒ (م ۲۴۵ھ) کے تصوف میں معرفت کے نظریہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "جس شخص کو خدا کی بہترین معرفت حاصل ہوتی ہے، وہی شخص خدا کی ذات میں سب سے زیادہ فنا ہوتا ہے"۔

ذوالنون مصری نے اس نظریہ پر بھی زور دیا ہے کہ خدا کا صحیح علم وجدان ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔

"عرفان" اور "وجدان" کے اصولوں کی وجہ سے ذوالنون مصریؒ کو تصوف کی تاریخ

میں بڑی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ "ذوالنون مصری صوفیہ کے سرخیل ہیں اور ان کا سلسلہ ان ہی سے چلتا ہے۔"

۱۱۔ ابوتراب نخشبی (م ۲۴۵ھ) فرماتے ہیں کہ "صوفی کو کوئی شے مکدر نہیں کر سکتی بلکہ ہر شے اس کی بدولت صفائی حاصل کرتی ہے۔"

۱۲۔ شیخ سری سقطی (متوفی ۲۵۷ھ) بغداد کے ایک معروف صوفی تھے، اور تمام علوم و فنون اور معارف و حقائق میں یکتائے روزگار تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ بغداد میں دوکانداری بھی کرتے تھے، ایک دن ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں بزرگ نے جو کوہ لبنان میں گوشہ گیر ہیں، آپ کو سلام کہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس پیر نے پہاڑ کی سکونت اختیار کی تو یہ کوئی بڑا کام نہیں کیا، مرد خدا کو چاہیے کہ میدان میں آئے اور بازار میں رہ کر مشغول بحق ہو۔

امام قشیری نے اپنے رسالہ میں تصوف کے بارے میں شیخ ممدوح کا یہ قول نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "تصوف تین چیزوں کا نام ہے، صوفی کا نورِ معرفت اس کی پرہیزگاری میں خلل انداز نہ ہو۔ دوسرے کسی علم کے باطن کی ایسی تفسیر نہ کرے جو کتاب و سنت کے نقیض ہو۔ تیسرے اپنی کرامات کے بل پر محارم اللہ کے پردے کو چاک نہ کرے۔"

۱۳۔ بایزید (ابویزید) بسطامی (متوفی ۲۶۱ھ) نے صوفیہ میں سب سے پہلے "فنا و بقا" کے مسئلہ کو رواج دیا، چنانچہ ان کا قول ہے کہ "جو شخص اپنے آپ کو حق (یعنی خدا) میں فنا کرتا ہے وہ زندگی جاوید پاتا ہے۔" لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ راہ خدا کیا ہے؟ بولے "راہ سے گم ہو کر فنا فی اللہ ہونا۔"

ابو علی سندھی نے ان کو "تجرید التوحید" کی تلقین کی تھی، اور اس کے بعد بایزید بسطامی نے

"فنا فی التوحید" کے بارے میں گفتگو کی، میری رائے میں "تجرید التوحید" اور "فنا فی التوحید" وحدت الوجود کے عقیدہ کی طرف پہلا قدم تھا، کیونکہ ان نظریوں میں توحید کی جو تفسیر کی گئی ہے وہ انسان کو وحدت الوجود کے عقیدہ کی طرف لے جاتی ہے، بایزید بسطامی نے خود کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے جو شطحات تذکروں میں منقول ہیں، ان میں ان کا وحدت الوجود کی طرف صریح میلان پایا جاتا ہے۔

۱۴۔ ابوحفص حداد نیشاپوری (م ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں کہ "تصوف سارے کا سارا ادب ہے، ہر ایک وقت کے لیے ایک ادب ہوتا ہے، اسی طرح ہر ایک مقام اور حال کے لیے بھی ایک ادب ہے، جس شخص نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھا، وہ مردانِ خدا کے درجہ کو پہنچا۔"

۱۵۔ سہل بن عبد اللہ تستری (م ۲۸۳ھ) نے فرمایا کہ "ہمارے اصول چھ ہیں: کتاب اللہ کو مضبوط پکڑنا۔ رسول اللہ (صلعم) کے اسوہ کی پیروی کرنا، حلال کھانا۔ لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا، اگرچہ وہ ہمیں عذر پہنچائیں۔ حرام سے پرہیز کرنا اور معاہدات کا بلا توقف پورا کرنا۔

۱۶۔ ابوالحسین احمد نوری (م ۲۹۵ھ) کا قول ہے کہ "دنیا سے نفرت کرنا اور خدا سے محبت کرنا تصوف ہے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "تصوف رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق کا نام ہے۔"

۱۷۔ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) فرماتے ہیں کہ "تصوف استصفا کا نام ہے، جو شخص اس طرح سے منتخب ہو کر ماسوا اللہ سے صاف اور منزہ کر دیا جائے، وہی سچا صوفی ہے۔" تصوف کے بارے میں آپ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "تصوف کا مفہوم یہ ہے کہ حق پہلے تجھے مارے اور پھر اپنے اندر زندہ کرے (یہ وہی فنا و بقا کا تصور ہے جس کو بایزید بسطامی پیش کر چکے تھے،

۱۸۔ شیخ ابوبکر شبلی (م ۳۳۴ھ) فرماتے ہیں کہ "صوفی وہ ہے جو دونوں جہانوں

میں اللہ کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھے۔" انکا دوسرا قول یہ ہے کہ صوفی خلق سے منفصل اور حق سے متصل ہوتا ہے۔"

۱۹۔ شیخ علی ہجویریؒ (پانچویں صدی ہجری) کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ "قاعدۂ ایں طریقت بر تجرید نہادہ اند..... و شرط آداب مجرد آنست کہ چشم را از نامشائست باز دارد و نادیدنی نبیند و آتش شہوت بگرسنگی بنشاند و دل از دنیا و مشغولی حوادث نگاہ دارد۔"

۲۰۔ حسین بن منصور حلاج (مصلوب ۳۰۹ھ) کے بہت سے اقوال اور شطحیات تذکروں اور دیگر کتب تصوف میں منقول ہیں، لیکن تصوف کے بارے میں جو بات اس نے تختۂ دار پر کہی تھی، اسکی انتہائی کم ظریفی نہ صرف لائق شنید بلکہ قابل داد ہے، سبط ابن الجوزی مرآۃ الزمان میں لکھتے ہیں کہ جس وقت لوگوں نے حلاج کو دار پر کھینچ رکھا تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تصوف کی تعریف کیا ہے؟ (ما حدُّ التصوف؟)۔ اس نے جواب دیا کہ "یہی جو کچھ تم دیکھ رہے ہو!" (قال: ما ترون!)

مجھے بیحد افسوس ہے کہ اپنے دیگر مشاغل کی وجہ سے میں زمانہ مابعد کے صوفیہ کے اقوال کا استقصاء نہ کر سکا۔ لہٰذا یہ کام میں دیگر احباب پر چھوڑتا ہوں، بہر حال دوسری اور تیسری صدی ہجری کے صوفیہ کے جو اقوال میں نے صفحات بالا میں جمع کر دیئے ہیں، وہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ یہ زمانہ تصوف کی تشکیل کا ہے، جس میں اس کے بہت سے خصوصی خط و خال نمایاں ہو چکے تھے، ان اقوال کے تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں تصوف محض اسلامی زہد کی ایک مؤکد صورت تھی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس میں مختلف نوعیت کے دیگر عناصر شامل ہوتے گئے اور نئے نئے مباحث پیدا ہوتے گئے۔ تصوف کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن العربی اور ابن الفارض کو چھوڑ کر اکثر مسلمان صوفیہ عجمی تھے، جو بیشتر ایران کی خاک سے اٹھے تھے، لہٰذا یہ امر باعث تعجب نہیں کہ تصوف کی موجودہ شکل و صورت بہت حد تک ان ہی کے تصورات اور ذہنی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

(باقی)

بانی درس نظامی ملّا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی، استاد شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۳)

ٹیلہ شاہ پیر محمد

مشہور چشتی بزرگ شاہ پیر محمد صاحب (وفات ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۸ء) کا مزار دریائے گومتی کے کنارے ایک بہت اونچے ٹیلے پر واقع ہے، اور اس ٹیلے پر ایک عالیشان وسیع و عریض مسجد بھی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کرایا تھا، صاحب بحر زخار کا کہنا ہے کہ شاہ پیر محمد صاحب کے مزار کی عمارت اور مسجد اودھ کے صوبہ دار فدائی خاں نے تعمیر کرائی تھی، مزار اور مسجد سے متصل آراضی بھی تھی جس پر

خلیفہ شاہ ملا نقشبند بران ٹیلہ (کذا) نقش زدہ	(حضرت شاہ پیر محمد صاحبؒ کے) خلیفہ اور جانشین
عمارات و حویلی بنا کردہ اند و تا امروز	ملا (غلام) نقشبند نے (جو ملا نظام الدین
اولاد ملا ممدوح دران مکان برپاست	کے اساتذہ میں تھے) کچھ عمارتیں اور حویلی
قائم و متمکن	بنالی تھیں، ملا غلام نقشبند کی اولاد اب تک
	(زمانۂ تصنیف یعنی ۱۲۲۶ھ تک) وہاں
(اغصان الانساب قلمی)	رہ رہی ہے اور قابض و متمکن ہے۔

ملا غلام نقشبندؒ مدرس بھی تھے اور رشد و ہدایت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، انکی خدمت میں علوم ظاہری اور باطنی کے طلب گار آتے رہتے تھے، اور مسجد بنا کردۂ عالمگیر اور عمارات تعمیر کردہ

ملا غلام نقشبند ہی ان کا رہنا ہوتا تھا، ملا غلام نقشبند کی وفات کے بعد (۱۱۲۶ھ) درس و تدریس کا سب سے بڑا مرکز ملا نظام الدین کا آستانہ تھا، خود ملا نقشبند کے صاحبزادگان بھی ملا نظام الدین سے شرف تلمذ رکھتے تھے، ملا صاحب کے طلبہ کی قیام گاہ یہی ٹیلہ شاہ پیر محمد صاحب تھی۔

مرزا محمد حسن قتیل کا کہنا ہے کہ:

"اب سے پہلے (زمانۂ تصنیف یعنی ۱۲۲۷ھ سے پہلے) شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر جو لکھنؤ میں دریا کے کنارے مشہور جگہ ہے، سات سو طلبہ کے رہنے، کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے لیے بادشاہ ہندوستان کی طرف سے ضروری مشاہرہ مقرر تھا۔" (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

"اب سے پہلے" کا ذکر کرنے کے بعد مرزا قتیل اپنے زمانے کے طلبۂ علوم کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہیں، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

"اس ملک میں زیادہ تر طلبہ کا طریقہ یہ تھا کہ بعض...... کسی دوسرے کی روٹیوں کا محتاج نہ تھے، جب یہ لکھنؤ آتے تھے تو ان کے والدین تین چار روپے مہینہ یا اس سے زیادہ ان کے خرچ کے لیے ماہ بماہ بھیجتے تھے، اور بعض کو مدرسہ سے کھانا ملتا تھا...... اس طرح امرا بھی حسب حیثیت اس فرقۂ متعلمین کی خدمت کرتے تھے، چونکہ امرا کی طرف سے ہر عالم کے لیے ایک یا دو گاؤں مقرر تھے، اس لیے سب ہی علما اپنے شاگردوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ رات کے وقت مطالعہ کے لیے چراغ کا تیل بھی استاد کی طرف سے ملتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ وہ علما رہے نہیں اور فیاضی نے امیروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، طلبہ حیران پریشان اور تباہ حال ہیں، بعضوں کو تو بیحد پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جب کہیں آدھ سیر آٹا ہاتھ آتا ہے، جو فارسی جانتے ہیں وہ بچوں کو پڑھانے کی نوکری کسی ہندو کے یہاں کر لیتے ہیں، اور مقررہ اوقات میں اپنے استاد کی خدمت میں پڑھنے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں، جو طلبہ فارسی نہیں جانتے وہ

معاشی طور پر بہت پریشان رہتے ہیں، اگر خوش نصیبی سے کوئی ہندو یا مسلمان جسے عربی پڑھنے کا شوق ہے، ان کے ہاتھ آگیا تو واہ واہ ورنہ روتے چھلکتے بغیر تحصیل علم کے اپنے گھر واپس ہو جاتے ہیں...... جب کوئی شخص کسی طالب علم کے لیے آدھا سیر آٹا مقرر کرتا ہے تو وہ طالب علم کہاوت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ میرے لیے جاگیر مقرر ہو گئی ہے۔" (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی رہائش کا سب سے بہتر انتظام شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر تھا، جہاں بیک وقت سات سو طلبہ کی گنجائش تھی، ملا نظام الدین کے طلبہ کے سلسلے میں بھی ٹیلے پر قیام کی متعدد روایتیں ملتی ہیں، ملا صاحب کے مشہور شاگرد مولانا حقانی ٹانڈوی اور مولانا عبد اللہ امیٹھوی کے بارے میں تو صراحتہً مذکور ہے کہ وہ ٹیلے ہی پر قیام پذیر تھے۔ اور اسی ٹیلے پر فارغ التحصیل طلبہ کا جلسۂ دستار بندی بھی ہوا کرتا تھا، اور ملا نظام الدین اس کے صدر نشین ہوا کرتے تھے، اسی جلسۂ دستار بندی میں فرزند ملا نظام الدین (ملا عبد العلی بحر العلوم) کے ساتھ ایک واقعہ ہو گیا تھا، جس نے عبد العلی کو بحر العلوم بننے پر آمادہ کر دیا، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا بیان ہے:-

"میں نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ چونکہ استاذ الہند (ملا نظام الدین) کے یہی ایک صاحبزادے تھے (یعنی ملا عبد العلی بحر العلوم) اور آخر عمر میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے محبت اور پیار میں زائد بسر ہوئی، والد ماجد کے انتقال کے وقت گو کتب درسیہ کی تحصیل سے فراغت ہو چکی تھی، مگر علم کی جانب رغبت نہ تھی، اس زمانے میں دستور تھا کہ فاتحۃ الفراغ پڑھنے والے شاہ پیر محمد صاحب کے عرس کے موقعہ پر حاضر ہوتے، اور اس عرس میں اکابر علمائے وقت موجود ہوتے، ان کے سامنے دستار بندی ہوتی، استاذ الہند کی زندگی میں استاذ الہند ہی

اس مجلس کے صدر و مسند نشین ہوتے، جس سال حضرت (استاذ الہند) کی وفات ہوئی اسی سال آپ کی وفات کے بعد جب یہ موقعہ دستار بندی کا آیا حضرت بحر العلوم بھی حسب معمول گئے، مگر صرف تماشا دیکھنے کو، بٹیر کی کا ایک ہاتھ میں تھی، جس وقت دستار بندی کی رسم ادا ہونے لگی تو کسی نے زور سے ان کو دھکا دیا اور کہا کہ "کہاں بڑھے چلے جاتے ہو" ملا بحر العلوم نے جواب دیا کہ "مجھ کو نہیں جانتے، میں ملا نظام الدین کا لڑکا ہوں"، اس شخص نے کہا کہ "سبحان اللہ! اگر استاذ الہند کے تم بیٹے ہوتے تو مسند پر صدر میں ہوتے یا یہاں بٹیر کی کا ایک ہاتھ میں لیے ہوئے ہوتے"، مولانا بحر العلوم کی حمیت جوش میں آگئی، کابک وہاں ہی توڑ ڈالی اور بٹیریں اڑا دیں اور گھر آکر کتاب بغل میں لی اور پدر بزرگوار کے مزار پر حاضر ہو کر دیر تک گریاں رہے، اس کے بعد کتاب کھول کر مطالعہ شروع کیا جہاں ذرا بھی اشکال ہوتا، روحانیت پدر بزرگوار سے مدد پاتے، یہاں تک کہ فاضل بے نظیر جامع معقول و منقول، عالم علوم ظاہر و باطن ہو گئے۔" (تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ)

خاندان فرنگی محل کے متقدم تذکرہ نگار ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی ٹیلے والے واقعہ کا ذکر تو نہیں کرتے لیکن مفہوم تقریباً یہی وہ بھی بیان کرتے ہیں:۔

بعد وفاتش فرزند ارجمندش بمطالعہ کتب معقول و منقول مشغول گشت و ہر مشکلے کہ دریں باب بروے روی نمود بروحانیت والد خویش حل می گشت چنانکہ زبانی ثقات شنیدہ ام کہ مولانا عبد العلی محمد می گفت والدم چنانکہ در تربیتم در حیات خود

ملا نظام الدین کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند کتب معقولہ و منقولہ کے مطالعے میں مشغول ہوئے اور اس سلسلے میں جو بھی مشکل ان کے سامنے آئی اپنے والد ماجد کی روحانیت سے حل ہو گئی، چنانچہ میں نے معتبر حضرات سے سنا ہے

معروف بود ہم چناں بعد ممات نیز بتعلیم و تفہیم و کشف معضلات و حل مشکلات ہم متوجہ ہست...... در ابتدائے حال در مطالبات غامضہ و مواضعیکہ دراں لغزش پائے علماء می گشت بخدمت ملا کمال الدین مرحوم کہ تلمیذ خاص والدم بودند و بزرگ و حسن بطریق مناظرہ برائے طلب صواب و ادراک حق در مباحث و مقامات کتب متداولہ درسیہ مذاکرہ می کردم و ایشاں افادۂ تحقیقات غامضہ والدم و ہم تحقیقات خود می فرمودند و گاہے ترش رو و تنگ خاطر نمی گشت

(اغصان اربعہ مطبوعہ)

(مصنف نے ملا بحر العلوم کی حیات کے ۵۴ سال پائے تھے، لیکن ملاقات نہیں کر سکے، اسلیے کہ جب یہ پیدا ہوئے تو ملا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر جا چکے تھے، شاہجہانپور، رامپور، بوہار اور مدراس میں بحر العلوم کے آخری پچپن ۵۵ سال بسر ہوئے، اور مدراس میں انھوں نے وفات پائی) کہ مولانا عبد العلی بحر العلوم فرمایا کرتے تھے کہ والد ماجد جس طرح اپنی حیات میں میری تربیت فرماتے تھے، اسی طرح وفات کے بعد بھی مشکل مقامات اور دشوار علمی مسائل کے حل کے سلسلے میں میری تعلیم و تفہیم کی طرف متوجہ ہیں...... شروع شروع دشوار مسائل اور ان مباحث کے سلسلے میں جہاں علماء کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اپنے والد ماجد کے خاص شاگرد اور بزرگ و سن رسیدہ ملا کمال الدین مرحوم کی خدمت میں صحیح بات معلوم کرنے اور درسی کتابوں کے مباحث و مقامات کو کما حقہ سمجھنے کے لیے بحث و مباحثہ کرتا تھا اور وہ میرے والد ماجد کی نازک تحقیقات اور اپنی تحقیقات مجھ سے بیان کرتا تھا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ [illegible]

اگرچہ والد ماجد کے تلمیذ خاص بدمزہ اور تنگ دل نہ ہوتے ہوں گے لیکن تلمیذ خاص کے شاگردان خاص جو اپنے اپنے وقت کے علمائے اجل ہوئے ہیں، نیز دوسرے سن رسیدہ حضرات جو ایک ۱۸-۱۹ سالہ لڑکے کو ایک علمائے روزگار سے مناظرہ کرتے دیکھتے تھے وہ ضرور بدمزہ ہوتے تھے، بلکہ ان کو سخت ناگوار گزرتا تھا، ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی کا بیان ہے کہ

بہ راقم رسیدہ است کہ مردم از ملا کمال الدین گفتند کہ این طفل این قدر بحث و تکرار بحدت می نماید و بے ادبانہ کلام می کند و شما پاس اوی و دلجوئی او می فرمائید و گاہے رنجہ خاطر نمی شوند و بملائمت با او سخن می گویند این معنی پسند طبع تلامذہ و دیگر عزیزان و دوستان نیست بزرگان را تادیب خوردان با تعلیم و تفہیم مناسب است نہ کہ اینہا را ہمسر خود گردانند

راقم کو بعض ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ لوگوں نے ملا کمال الدین سے کہنا شروع کر دیا کہ یہ لڑکا آپ سے اسقدر بحث و تکرار کرتا رہتا ہو اور گستاخی سے بات چیت کرتا ہو، آپ اسکا بہت لحاظ و دلجوئی کرتے رہتے ہیں، کبھی غصہ نہیں ہوتے، ہمیشہ ملائم انداز میں گفتگو فرماتے رہتے ہیں، یہ آپ کا انداز شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کو ناگوار ہے، بزرگوں کو مناسب ہے کہ چھوٹوں کو پڑھانے اور سمجھانے میں مودب رہنا سکھائیں، نہ کہ یہ صورت کہ چھوٹوں کو اپنے برابر کا سمجھکر بات چیت کریں،

ملا کمال الدین تلمیذ خاص ملا نظام الدین سے لوگوں نے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کے خیالات کی بخوبی وضاحت سے ترجمانی کر دی اور مدلل انداز سے ان کو اپنا رویہ بدلنے کا مشورہ بھی دیدیا لیکن ملا کمال الدین نے اس کا جو جواب دیا وہ بھی یادگار ہے:

جواب داد کہ اول این طفل صاحبزادہ من است کہ

ملا کمال الدین نے جواب دیا پہلی بات تو یہ کہ

من استفادہ علوم بخدمت والدش کردہ ام آنچہ من با او می کنم در مقابلۂ احسانات والدش قدرے ندارد

یہ لڑکا میرا استاد زادہ ہے، اسکے والد ماجد کی خدمت میں میں نے یہ سب علوم حاصل کیے ہیں جو کچھ میں اس لڑکے کے ساتھ کر رہا ہوں وہ اسکے والد ماجد کے احسانات کے دیکھتے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

دوم آنکہ این طفل درین عمر آنچہ بمحنت و مشقت خود حاصل کردہ است یقین می دانم کہ والدش را درین سن حاصل نبود ہر چند در اواخر وقت علامۂ زمان بودہ است

دوسری بات یہ کہ اس عمر میں اپنی محنت اور مشقت سے اس لڑکے نے جو حاصل کر لیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اسکے والد ماجد (ملا نظام الدین) نے جب وہ اسکی عمر کے تھے حاصل نہ کیا ہوگا، اگرچہ آخر عمر میں وہ اپنے عہد کے بڑے عالم ہو گئے تھے۔

سوم آنکہ درین عرصۂ قلیل مطالعۂ کتب قدما و نظر بر تصانیف متاخرین آنچہ این کس را میسر گشتہ بعلما در تمام عمر حاصل نمی شود

(اغصان اربعہ مطبوعہ)

تیسری بات یہ کہ اس چھوٹی عمر میں اس لڑکے نے متقدمین کی کتابوں اور متاخرین کی تصانیف پر جو عبور حاصل کر لیا ہے وہ دوسرے علما کو تمام عمر میں حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اس کے آگے کی عبارت ہو سکتا ہے کہ ملا کمال الدین ہی کا "قول" ہو اور سیاق کلام کے دیکھنے سے یہی اغلب ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہی خیال ہے کہ ملا کمال الدین ہی کا یہ قول ہے مگر ممکن ہے کہ مصنف (ملا ولی اللہ فرنگی محلی) کا اخذ کردہ نتیجہ ہو، بہرحال:

این محض بتوجہ روح والدش کہ جامع علوم ظاہر و باطن بود و ولایتش بحد کمال رسیدہ، او را حاصل گشتہ درین صورت

اور یہ سب کچھ اس کے والد ماجد کی توجہ روحانی کا ثمرہ ہے، وہ علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے، اور انکی ولایت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی، ان

بحسب ظاہر اگرچہ صغر سن دارد و لاکن
در مقام بحث و تکرار رتبۂ علامہ صدر الدین
شیرازی و محقق دوانی دارد

ان حالات میں گو دیکھنے میں وہ ابھی کم سن ہے
لیکن بحث و مناظرہ میں اس کا رتبہ علامہ صدر الدین
شیرازی اور محقق دوانی کے برابر ہے۔

ملا بحر العلوم سے متعلق اس واقعہ کی اتنی تفصیل سے اصل غرض اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے کہ استاد کے حق کی حفاظت و نگہداشت کا لحاظ من جملۂ فرائض تلامذہ ہمیشہ رہا ہے، اور ملا کمال الدین کے تلامذہ جو استاد زادے کی جرأت آمیز گفتگو پر اظہار ناگواری کرتے تھے وہ بھی استاد کے حق کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔ پھر بھی استاد زادے کے طرز گفتگو سے ان کو جو ناراضگی محسوس ہوئی تو ظاہر ہے کہ "حق استاد" کے حدود سے وہ متجاوز ہو گئی تھی، ملا کمال الدین کے جواب سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ملا نظام الدین کے ایسے استاد کا حق اور احسان عام اساتذہ کے حقوق و احسانات سے اتنا زیادہ اور خصوصی تھا کہ ان کے بیٹے کی گستاخانہ گفتگو اور ان کے شاگردوں کا بُردبار انداز کلام اس کے مقابلے میں کچھ بھی معاوضہ نہیں دے رہا تھا۔

بہر حال ملا بحر العلوم جب واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے، وہ اس شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر پیش آیا تھا جہاں نہ صرف یہ کہ ملا نظام الدین کے تلامذہ رہتے تھے، بلکہ وہیں دستار بندی کا سالانہ جلسہ بھی ہوا کرتا تھا، جس کے مسند نشین ملا نظام الدین ہوا کرتے تھے،

اور ملا بحر العلوم جب اپنی سابقہ لاپروائیوں پر متنبہ ہو کر آبائی شغل کی طرف متوجہ ہوئے تو یہی نہیں کہ ملا کمال الدین نے ان کے سن و سال کے لحاظ سے ان کی عظیم لیاقت کی داد دی بلکہ دوسرے مؤرخین بھی جنھوں نے ملا بحر العلوم کو دیکھا نہ تھا، صرف ان کا زمانہ پایا تھا، یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

وہ اپنے والد ماجد کے سوا اس جماعت میں کسی کے شاگرد نہ تھے، انھوں نے شرح سلم کے سلسلے میں مولوی حمد اللہ سندیلوی پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں، وہ ملا کمال الدین کو بھی خاطر میں نہیں

لاتے تھے، کہتے ہیں جو تبحر ان میں تھا، وہ ان کے والد میں بھی نہ تھا۔ ("ہفت تماشا" از مرزا قتیل فارسی سے ترجمہ)[1]

ملا نظام الدین کے تلامذہ کی فہرست، پچاس سالہ درس و تدریس کے نتیجے میں، خاصی طویل ہونا چاہیے تھی، صرف ان ہی تلامذہ کی جامع فہرست پیش کرنا جنھوں نے اول سے آخر تک ملا صاحب سے استفادہ کیا، آسان نہیں، اور اگر ان "مردم بسیار" کو بھی شامل کر لیا جائے، جنھوں نے برائے اعتبار "فاتحۂ فراغ از مولوی گرفتند" کے تحت سلسلۂ تلمذ ملا صاحب تک پہنچا کر "بین الفضلاء علم امتیاز" بلند کرنے کی تمنا پوری کی تو احاطہ اور بھی دشوار ہو جائے گا۔

شاگردوں میں صرف فرنگی محل میں مقیم بیٹے، بھتیجوں، پوتوں اور آبائی گھر سہالی کے بنی اعمام کا حساب لیا جائے تو تعداد کے لحاظ سے خواہ یہ فہرست مختصر معلوم ہو لیکن استاذ کی عظمت اور قوت تدریس کا سکہ قلوب پر بیٹھانے کے لیے بہت کافی ہے۔

اولین تلامذہ میں میراں کمال الدین تو تھے ہی، بنگالہ کے رہنے والے بقول صاحب اغصان الانساب اور عظیم آبادی صاحب نزہۃ الخواطر اور بہاری مرزا قتیل کے بیان کے مطابق جنھوں نے ملا صاحب سے فارغ التحصیل ہو کر فتحپور (ضلع بارہ بنکی) میں مسند درس بچھائی تھی، اور ملا صاحب کے ایک نامور اور صاحب درس شاگرد ملا کمال الدین سہالوی کو درسیات کے مختصرات پڑھائے تھے، مگر میراں کمال رشتہ داروں کی فہرست میں شامل نہیں، اگرچہ اولین تلامذہ میں سرفہرست قرار دیے جا سکتے ہیں،

بڑے بھائی ملا محمد اسعد بن ملا قطب الدین شہید کے اکلوتے بیٹے جو اپنے نامور چچا ملا نظام الدین سے آٹھ سال کے قریب چھوٹے تھے، جن کا نام غلام مصطفےٰ تھا، اور منجھلے بھائی ملا محمد سعید کے بڑے بیٹے

---

[1] ہفت تماشا از مرزا قتیل کی عبارتوں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر استاد شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترجمہ ہفت تماشا سے بڑی حد تک لیا گیا ہے، ترجمہ ہفت تماشا حال ہی میں ندوۃ المصنفین کے مطبوعات میں مکتبہ برہان اردو بازار دہلی سے شائع ہوا ہے۔

جو ملا صاحب سے چودہ سال چھوٹے تھے، جن کا نام احمد عبدالحق تھا، یہ دونوں بھتیجے لٹے ہوئے کنبہ کے ساتھ سہالی سے آکر فرنگی محل میں آباد ہوئے، جبکہ ایک خوردسال تھے اور ایک شیرخوار، پھر منجھلے بھائی ملا سعید کے دوسرے بیٹے جو فرنگی محل ہی میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی سے دو سال اور اپنے چچا سے سولہ سال چھوٹے تھے، جن کا نام عبدالعزیز بن ملا محمد سعید تھا، یہ تینوں بھتیجے ملا نظام الدین کے اولین تلامذہ میں تھے، حقیقی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا جو "در جنب برادر بزرگوار بتدریس علوم مشغول" ہوگئے تھے، صحیح روایت کے مطابق شاگرد نہ تھے، "ہم استاد" تھے، اور فرائض درس و تدریس میں اپنے برادر بزرگ کے معاون و مددگار عرصے تک رہے، پھر ملا نظام الدین بلکہ بزرگ مرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی ہی کی حیات میں تارک الدنیا ہوگئے، درس و تدریس ہی نہیں اہل و عیال اور گھر بار بلکہ ملک و وطن سب کچھ چھوڑ دیا، مدینہ منورہ کے قصد سے یکہ و تنہا روانہ ہوگئے، وہیں سپرد خاک ہوے، مدفن اور وفات کے سلسلے میں اپنے دونوں بڑے بھائی ملا محمد اسعد اور ملا محمد سعید ہی کے ہم قسمت ثابت ہوئے،

خاندان کے اولین شاگردوں میں ملا احمد عبدالحق مصنف اور صاحب درس گذرے ہیں، وہ ملا صاحب سے چودہ سال چھوٹے تھے، لیکن وفات میں صرف چھ سال پیچھے رہے، اور انکے چھوٹے بھائی ملا عبدالعزیز اپنے بڑے بھائی سے دو سال قبل ہی وفات پاگئے، ملا صاحب کے سب سے بڑے بھتیجے ملا غلام مصطفےٰ، فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملاواں (ضلع اناؤ) کے قاضی ہوگئے، منصب قضا پر عزل و نصب کے کئی دور دیکھنے کے بعد اپنے بڑے بیٹے ملا محمد علی کے ساتھ عازم دہلی ہوئے، کہ معاملات کا آخری تصفیہ کرائیں، راستے میں دونوں باپ بیٹے غالباً شہید کر دیے گئے۔

دوسری پیڑھی میں مذکورہ تینوں بھتیجوں کے علاوہ جو اولین تلامذہ تھے ملا صاحب کے چھوٹے بھائی ملا محمد [illegible] بیٹے ملا احمد حسین اور ملا عبدالحی اور خود اپنے اکلوتے فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم بھی ممتاز تلامذہ میں تھے

(ملا بحرالعلوم ملا صاحب کے آخری دور کے شاگرد تھے) پھر تیسری پیڑھی میں بڑے بھتیجے اور شاگرد ملا قاضی غلام مصطفےٰ کے تینوں فرزند ملا محمد علی، ملا محمد ولی اور ملا محمد حسن (جو ملا حسن کے نام سے مشہور ہیں) منجھلے برادر زادے اور شاگرد ملا احمد عبدالحق کے بڑے بیٹے ملا محب اللہ، چھوٹے بھتیجے اور شاگرد ملا عبدالعزیز کے اکلوتے بیٹے ملا محمد یعقوب ان سب نے ملا نظام الدین ہی سے پڑھا، اور ان میں سے بیشتر نے ملا صاحب ہی سے سند فراغت بھی حاصل کی، ملا حسن (بن ملا قاضی غلام مصطفےٰ) ملا محمد ولی اور ایک روایت کے مطابق ملا احمد انوارالحق (بن ملا احمد عبدالحق) ابھی تکمیل نہیں کر سکے تھے کہ ملا صاحب کی وفات ہوگئی، درسیات کی تکمیل ملا صاحب کے شاگردوں ملا کمال الدین سہالوی ثم فتحپوری، ملا احمد حسین فرنگی محلی اور ملا بحرالعلوم وغیرہ سے ان حضرات نے کی۔

یہ سب ملا صاحب کے خاندان کے حضرات تھے، جنھوں نے فرنگی محل ہی میں (بعض نے ملا صاحب کی حیات میں اور بعض نے ملا صاحب کی وفات کے بعد) درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور سینکڑوں تشنگان علوم کو سیراب کیا، ان میں سے ملا کمال الدین سہالوی فتحپوری، ملا احمد حسین اور ملا بحرالعلوم کے تلامذہ نام آور ہوئے ہیں،

ملا کمال الدین سہالوی

ملا کمال الدین سہالوی (ثم فتحپوری) کے تلامذہ میں نامور ترین ملا حسن فرنگی محلی، ملا محمد برکت الہ آبادی، ملا احمد اللہ سندیلوی، ملا عبداللہ سندیلوی اور ملا محمد اعلم سندیلوی تھے، ان ہی ملا اعلم سندیلوی کے شاگرد رشید، ملا عبدالواجد خیرآبادی تھے، جن کے شاگرد رشید مولانا فضل امام خیرآبادی تھے، ان ہی مولانا فضل امام (والد ماجد مولانا فضل حق خیرآبادی) سے خیرآبادی سلسلۂ تلمذ جاری ہوا، اور دہلی، رامپور اور اودھ میں یہ سلسلہ کافی پھیلا۔ ملا کمال الدین سہالوی کے درس کا فیض مغربی اضلاع بجنور، مرادآباد

منظفر نگر اور سہارنپور وغیرہ میں ملا کمال کے تلامذہ کے ذریعہ دور دور تک اس وقت پھیلا، جب نواب نجیب الدولہ نے دارانگر متصل امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا، اور ملا کمال کے ممتاز شاگردوں کو بیش قرار تنخواہوں پر درس وتدریس کے لیے مامور کیا، رضی الدین محمود انصاری اپنی کتاب اغصان الانساب (قلمی) میں لکھتے ہیں :۔

دریں اثنا نواب نجیب الدولہ بہادر
کہ رئیس وامیر ذوی الاقتدار ملک نواح
شاہجہان آباد بودند مدرسہ بر دے
دریائے گنگ در مقام دارانگر کہ
متصل امروہہ و مرادآباد است
بنا کردہ علمائے ذوی الاحترام مثل
مولوی محمد برکت الہ آبادی کہ از
شاگردان رشید مولانا کمال الدین محمد
قدس سرہ کہ عنقریب ذکر شان
مرقوم قلم می گردد و مولوی محمد حسن
کہ ہمشیر زادہ وہم شاگرد مولانا موصوف
و مولوی محمد سالم خلف متوسط مولانا
ممدوح بودند و دیگر فضلائے ولایتی
و ہندی را بشاہرۂ معقول کہ صد بار روپیہ
باشد مقرر کردہ و علیٰ ہذا القیاس طلبہ

اسی زمانے میں نواب نجیب الدولہ نے جو دہلی
کے اطراف کے رئیس اور ذی اقتدار امیر تھے،
اودھ، مرادآباد کے قریب واقع دارانگر
میں دریائے گنگا کے کنارے ایک مدرسہ
قائم کیا جس میں بڑی بڑی تنخواہوں پر جو
سینکڑوں روپیہ تھیں، ممتاز علما کو جیسے
ملا محمد برکت الہ آبادی (ملا کمال الدین
سہالوی کے خاص شاگرد)، ملا حسن فرنگی محلی
(ملا کمال کے شاگرد اور بھانجے) اور
ملا محمد سالم (ملا کمال کے منجھلے فرزند اور
شاگرد) اور بہت سے ہندستانی اور غیر ملکی
علما کو مقرر کیا، اسی طرح بے شمار طلبہ کیلئے
بھی جن میں اطراف وجوانب کے شرفا کے
بچے اور دور دراز کے بچے بھی شامل تھے جب
استعداد ماہانہ وظیفہ بھی مدرسہ کی طرف سے

بہ اندازہ از شرفائے جوار وغیر جوار بدر آمدہ
حسب لیاقت آنہا معین نمودہ دراں مدرسہ
صورت تعلیم وتعلم نمودار گردید

مقرر کیا، اس طرح دارانگر کے
مدرسہ میں پڑھنے پڑھانے کی صورت
پیدا ہوگئی۔

ان شاگردان ملا کمال الدین کے ذریعہ ملا کمال کے استاد ملا نظام الدین کے درس کا سلسلہ دارانگر کے مدرسہ کے نکلے ہوئے طلبہ کے واسطے سے تمام مغربی اضلاع میں جن میں ہندوستان کی راجدھانی شاہجہان آباد (دہلی) بھی شامل ہے پھیل گیا، یہ وہ زمانہ ہے جب دلی میں ولی اللّٰہی خاندان کا حلقۂ درس خاصا وسیع ہو چکا تھا، اور اس خاندان کے سربراہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی دیگر علوم کے ساتھ تفسیر وحدیث وفقہ کی ترویج میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد ملا کمال الدین کے دو شاگرد ملا حسن فرنگی محلی اور ملا قطب الدین محمد ابن ملا کمال الدین سہالوی بھی شاہ صاحب کی حیات میں دلی پہنچ گئے تھے، اور ملا حسن نے وہاں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا، اور یہ اسی عہد کا واقعہ ہے جس کو مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" میں حسب ذیل الفاظ میں درج کیا ہے :۔

"ملا حسن (فرنگی محلی) نے کچھ مدت دلی میں قیام فرمایا تو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگردوں کو خبر ہوئی، وہ بھی ملا حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی مبحث علمی پر بحث کرنے لگے، ملا حسن نے جوابات معقولہ سے ان کی تشفی کر دی، وہ حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس گئے، اور ملا حسن کی تعریف کرنے لگے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "ان معقولیوں کو حدیث وقرآن سے بالکل بے خبری ہوتی ہے۔ یہ بیچارے عمر بھر قال الشیخ وقال الرازی میں پڑے رہتے ہیں"۔ ملا حسن اس عرصے میں رامپور واپس ہو چکے تھے، کسی نے بحر العلوم تک یہ واقعہ پہنچا دیا، بحر العلوم نے جواب میں "ارکان اربعہ" لکھ کر شاہ صاحب کی خدمت میں

بھیجی، حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں نہایت توصیف و مدح مولانا کی لکھی اور خط کے عنوان میں مولانا کو "بحر العلوم" کے لقب سے ملقب فرمایا، خدا کی قدرت کہ حضرت شاہ صاحب کے قلم سے نکلا ہوا خطاب آج عالم میں شہرت پاگیا اور اب اہل علم کے حلقوں میں نام اور شاہی خطاب کے زائد حضرت شاہ صاحب کا عطیۂ خطاب[1] ہی مشہور ہے۔" (ایضاً)

ان ہی ملا کمال الدین سہالوی کے ذریعہ ان کے استاد ملا نظام الدین کا فیض ہندوستان کے باہر بھی پہنچا، کس طرح پہنچا؟ اس سلسلے کا واقعہ اغصان الانساب (قلمی) کے مصنف نے بایں طور بیان کیا ہے:۔

مولوی عبدالرحمٰن یمنی کہ در یمن صاحب درس	یمن (ملک عرب) میں ایک عالم اور مدرس
بودند سالے برائے زیارت حرمین شریفین	مولوی عبدالرحمٰن تھے، ایک سال وہ
زادہما اللہ شرفاً در بیت اللہ آمدند	حج و زیارت کے سلسلے میں مکہ معظمہ آئے،
وہم دراں شخصے از شاگردانِ مولانا	اسی سال ملا کمال الدین سہالوی کے
ممدوح مشرف بزیارت کعبہ شریفہ آمدہ	ایک شاگرد بھی شرف حج و زیارت سے
بود، حسب اتفاق از مولوی عبدالرحمٰن	مشرف ہوئے تھے، اتفاق سے مولوی
یمنی دراں جا ملاقات دست داد	عبدالرحمٰن یمنی اور شاگرد ملا کمال کی ملاقات
چیزے بحث علمی بمیاں آمد چوں مولوی	مکہ معظمہ میں ہوگئی، آپس میں کوئی علمی بحث
عبدالرحمٰن بمقابلہ آں کس خود را ہیچ داں	چھڑ گئی، جب مولانا عبدالرحمٰن یمنی نے
دیدند مستفسر شدند کہ ایں علم از کدام	شاگرد ملا کمال کے مقابلے میں علمی اعتبار
فاضل آموختہ اید، ایں شخص مدح و تعریف	سے اپنے کو ہیچ پایا تو دریافت کرنے لگے کہ
استاد خود بیان کرد مولوی عبدالرحمٰن یمنی	کسی فاضل و عالم سے آپ نے پڑھا ہے شاگرد نے

[1] پھر جب بحر العلوم کسی سلسلے میں دلی تشریف لے گئے تو ان کی اتنی شہرت اور وقعت بڑھ چکی تھی کہ (باقی حاشیہ ص ۲۰۰ پر)

از بیت اللہ بارادۂ اخذ علم و تعلیم عازم	اپنے استاد ملا کمال الدین سہالوی کا نام
ہندوستان شدند و جویا بودہ بخدمت	لیا اور انکی مدح و توصیف کی، مولوی
مولانا موصوف رسیدہ پنج شش سال	عبدالرحمٰن یمنی مکہ معظمہ سے وطن جانے کے
اقامت نمودہ مجدداً کتب درسیہ خواندہ	بجائے علم حاصل کرنے سیدھے ہندوستان
وبخوبی علوم حاصل کردہ راہی وطن خود	کی طرف چل کھڑے ہوئے، ہندوستان
شدند و در انجا رسیدہ بر وسادۂ تدریس	پہنچکر ڈھونڈھتے ہوئے ملا کمال الدین
تمکین کردند و نام استاد خود در ملک عرب	سہالوی تک پہنچ گئے، اور پانچ چھ سال
بلند آوازہ گردانیدند	رہکر از سر نو کتب درسیہ ملا کمال الدین سے
	پڑھیں اور اچھی طرح تحصیل علوم کرکے اپنے
	وطن یمن واپس گئے، وہاں پہنچکر مسند تدریس
	بچھائی اور اپنے استاد ملا کمال الدین سہالوی
	کے نام کو ملک عرب میں خوب خوب شہرت دی۔

ملا کمال الدین کے بڑے فرزند ملا قطب الدین محمد نے اپنے والد ہی سے علوم حاصل کیے تھے، نکتہ سنجی اور دقت آفرینی میں وہ اس درجہ تک پہنچ گئے تھے کہ

ملا کمال الدین طاب ثراہ می فرمودند	ملا کمال الدین فرمایا کرتے تھے کہ اگر قطب الدین
کہ اگر قطب الدین درس می کردند از من	درس دینا شروع کردیتے تو مجھ سے کم نہ رہتے،
کمتر نمی بودند و حسرت می کردند کہ افسوس	ملا صاحب افسوس کرتے تھے کہ بیٹے کی طبیعت
طبیعت ایشاں راغب سوئے درس	پڑھانے کی طرف کسی طرح راغب نہیں ہوتی۔
نیست (اغصان الانساب قلمی)	

ملا قطب کے ایک ہم درس ملا محمد مستعان کاکوروی جو ملا کمال الدین کے شاگرد تھے کہا کرتے تھے:

روح مولانا مرحوم کلیتاً در جسم مولوی	ملا کمال الدین سہالوی کی روح مولوی
قطب الدین حلول کردہ است اگر درس	قطب الدین کے جسم میں پوری طرح سما گئی ہو
می کردند نام پدر عالی قدر خود را رونق	اگر وہ درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے
می دادند[1] (اغصان الانساب)	تو اپنے نامور باپ (ملا کمال الدین) کے نام کو

[1] ملا کمال الدین کے اس لائق و ہونہار فرزند نے درس و تدریس کی طرف کیوں توجہ نہیں کی، اس کی وجہ اغصان الانساب کے مصنف نے وہی بیان کی ہے جو اکثر علمی ذہنوں کی خانہ خرابی کی ہوا کرتی ہے، یعنی سیاست میں پڑ کر خدمت علم سے غافل ہو گئے، مصنف اغصان الانساب کا کہنا ہے کہ:-

ہرگاہیکہ مولوی قطب الدین محمد از تحصیل علم	مولوی قطب الدین محمد جب تحصیل علم کر چکے
فارغ شدند عم ایشاں قاضی جان محمد مرحوم	تو انکے حقیقی چچا قاضی جان محمد کسی ضرورت
بہ بیجے ہمراہ خود بہ شاہجہان آباد بردند	یا مقصد سے انھیں اپنے ہمراہ دلی لے گئے
در آں جا از امراء و اہلکاران شاہی ملاقات	(قاضی صاحب خود بڑے حکام رس اور دربار شاہی
کنانیدہ بکار دربار دنیا گزاشتند	تک پہنچنے والے آدمی تھے) انھوں نے
	دلی میں امیروں اور شاہی افسروں سے
	بھتیجے کی راہ و رسم کرا دی اور دنیاوی دھندوں

اس طرح ملا کمال الدین کا ایک ہونہار جانشین علمی دنیا سے درباری ماحول میں پہنچ کر خدمت علم سے بیگانہ ہو گیا، دلی کا دربار درہم برہم ہوا تو سید شرف الدین محمد عرف مولوی مدن شاہ (جو حضرت بڑے پیر صاحب کی اولاد میں تھے، اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے بڑی جاگیر پائے ہوئے تھے، نواح لکھنؤ میں قریہ خالص پور میں منظر پرشکوہ رئیسانہ فیاضیوں کے ساتھ زندگی گزارتے تھے) نے ان کو اپنے پاس بلایا، مولوی مدن کا کارخانہ درہم برہم ہوا تو

ملا کمال الدین سہالوی خود اس درجے کے فاضل تھے کہ تنہا وہی اپنے استاد ملا نظام الدین کے نام کو روشن کرنے کے لیے بہت تھے، ان کی ٹکر کا عالم، مدرس اور مصنف اس زمانہ میں دور دور کوئی دوسرا نہ تھا، ان کی تصانیف عروۃ الوثقیٰ[1]، شرح کبریت احمر اور حاشیہ شرح عقائد جلالی ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۰) ملا قطب الدین خانہ نشین ہو گئے، ہر چند شجاع الدولہ کے نائب راجہ بینی بہادر نے بلایا مگر قبول نہ کیا اسی خانہ نشینی کے عالم میں ۳ شعبان ۱۱۹۰ھ میں انتقال کیا، ملا قطب الدین، اغصان الانساب کے مصنف رضی الدین محمود انصاری کے حقیقی نانا تھے، ان کے بارے میں یہ ساری تفصیل نواسے ہی نے بیان کی ہے۔

قاضی جان محمد کے بارے میں جو ملا کمال الدین کے حقیقی بھائی تھے، اغصان الانساب کے مصنف نے ایک تاریخی واقعہ لکھا ہے، جس کو یہاں نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کسی اور تاریخ میں یہ نظر سے نہیں گزرا، ایک قلمی تصنیف میں درج رہ کر ہو سکتا ہے کہ کبھی معدوم ہو جائے، قاضی جان محمد کے والد قاضی دولت (جن کا ذکر اس سے قبل آیا ہے کہ وہ ملا قطب الدین شہید سہالوی کے شاگرد و متبنیٰ تھے، اور ملا شہید کی شہادت کے بعد واحد رشتہ دار تھے، جو خاندان ملا قطب شہید کے ساتھ سہالی سے فتحپور چلے گئے تھے)۔ فتحپور کے قاضی ہو گئے تھے، ان کے بعد قاضی جان محمد فتحپور کے قاضی ہوئے، پھر دلی گئے، جہاں سے کئی اور قصبات جیسے فرخ آباد کے اطراف کے قصبات بھوں گاؤں اور چھبرامئو وغیرہ علاقہ بہرائچ کی سند قضاۃ حاصل کر کے حکم شریعت کو رواج دیتے رہے، دربار شاہی تک پہنچ ہو چکی تھی، "عطائے پالکی" سے سرفراز تھے، محمد شاہ کا زمانہ تھا، اس کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے، "مدام حاضر باش دربار شاہی بود" جری اور بہادر ایسے تھے کہ "در آں عصر مثل شاں کمتر کسے بودہ باشد"۔ یہ دلی ہی میں تھے جب نادر شاہ کا حملہ ہوا اور قتل عام سے دلی تاراج ہوئی، نادر شاہ ابھی دلی میں مقیم تھا کہ عید الاضحیٰ (بقر عید) آگئی، اور یہ خطرناک اور خوفناک سوال بادشاہ اور امرائے سلطنت کے سامنے آ کھڑا ہوا کہ عید کا خطبہ جس میں خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی لیے جاتے ہیں، کیسے پڑھا جائے گا اور کون پڑھے گا؟ نادر شاہ شیعہ تھا، اس کی سفاکی، قہرناکی اور خونریزی کا ہولناک تجربہ پوری دلی کو ابھی ابھی ہوا تھا، اس سوال کے سامنے آتے ہی "اہلکاران سلطنت در تہلکہ افتادند و ہوش و حواس در باختند

(باقی حاشیہ ص ۲۰۲ پر)

حاشیہ طبع ہو چکا ہے ، اور عروۃ الوثقیٰ اور شرح کبریت احمر مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی) کے مولانا عبد الحی فرنگی محلی کلکشن میں مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے ، مرزا قتیل عروۃ الوثقیٰ سے اس قدر مرعوب نظر آتے ہیں کہ ان کا خیال ہے :-

کتابے موسوم بہ عروۃ الوثقیٰ نوشتہ کہ	ملا کمال نے ایک کتاب عروۃ الوثقیٰ لکھی ہو
تحاریر علماء در کشفِ غوامض و حل دقائق	جس کی باریکیوں کے سمجھنے اور جس کے دقیق
آں حیراں شدند ("ہفت تماشا")	مطالب کے حل کرنے سے بڑے بڑے علماء عاجز ہیں

پھر لکھتے ہیں :-

میر کمال الدین نامی ساکن بہار نیز شاگرد	میر کمال الدین وہی جن کا ذکر میراں کمال الدین
ملا نظام الدین بود چنانچہ میر مزبور و ملا	بنگالی کے نام سے اوپر گزر چکا ہے اور جن سے ملا
کمال الدین ہر دو را "کمالین" می گفتند	کمال الدین سہالوی نے فتحپور میں مختصرات درس
شاگرد انش بیشتر در اطرافِ بنگالہ اند	پڑھے تھے) بہار کے رہنے والے بھی ملا نظام الدین
	کے شاگرد تھے ، چنانچہ ملا نظام الدین ، میر کمال الدین
(ہفت تماشا)	اور ملا کمال الدین کو "کمالین" کہا کرتے تھے ، میر کمال الدین

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) "واحدے را یارائے خواندن خطبہ نمی شد" ، خطیب قدیم و دیگر علماء کہ در پایۂ تخت حاضر بودند کنارہ کشی کردی یہاں تک کہ ایک روز باقی رہ گیا ، اب بادشاہ کو تشویش لاحق ہوئی کہ کس سے خطبہ پڑھنے کو کہے ، قاضی جان محمد جو حاضر دربار شاہی رہا کرتے تھے ، عرض پرداز ہوئے کہ "بندگان عالی را دریں باب فکرے نباید بندہ حاضر است در خواندن خطبہ دریغ و تساہل نخواہد کرد گمان ایں است کہ نادر شاہ از شنیدن نامہائے خلفاء ، ما را بقتل خواہد رسانید جانم فدائے حضور باد" ، چنانچہ عید الاضحیٰ کے روز قاضی جان محمد سہالوی ثم فتحپوری دلی کی عید گاہ گئے اور دونوں بادشاہوں (نادر شاہ اور محمد شاہ) کی موجودگی میں "خطبہ با آواز بلند و اسمائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم با مناقب و مفاخر در برو بے بادشاہ خونخوار خواندند" ، لیکن نہ قتل ہوئے نہ گرفتار ہوئے بلکہ "در ہموں جا از پیش گاہ بادشاہ خود و ہم نادر شاہ لبطائے دو تائے خلعت سرفرازی اندوختند"

اس طرح میران کمال الدین ساکن بنگالہ یا ساکن بہار نے اپنے استاد کا فیض بنگال میں عام کیا جہاں ان کے شاگردوں کی کثرت ہوئی اور ملا کمال الدین سہالوی اودھ میں سرگرم فیض رسانی رہے ۔ میران کمال کے بارے میں ملا عبد الاعلیٰ (حفید ملا نظام الدین فرنگی محلی) نے لکھا ہے :-

محبت با استاد بسیاری داشتند چنانچہ بشنیدن	استاد ملا نظام الدین سے بے پناہ محبت رکھتے تھے ،
خبر کاذب در باب وفات استاد سید کمال	استاد کے وفات کی جھوٹی خبر سنکر اس قدر غمگین
از غم فوت کردند و سید ظریف بجریان اشک	ہوئے کہ اس رنج و غم میں جان دیدی اور
کور شدند ۔	اور سید ظریف (یہ ملا صاحب کے دوسرے شاگرد اور
(رسالہ قطبیہ قلمی)	میران کمال کے ہم وطن) روتے روتے بینائی
	کھو بیٹھے ۔

مزید لکھا ہے :-

ہر دو صاحب تصانیف بودند و شاگردان	دونوں شاگرد (سید ظریف و میران کمال الدین)
معتبر می داشتند اعلیٰ شاگردانش مولوی	صاحب تصانیف بھی تھے ، اور لائق و معتبر
اسد اللہ جہانگیر نگری مدرس و مصنف	شاگرد بھی رکھتے تھے ، جن میں ایک مولوی
بود ۔ (رسالہ قطبیہ قلمی)	اسد اللہ جہانگیر نگری مصنف اور مدرس گزرے ہیں ۔

ملا کمال الدین سہالوی کے براہ راست شاگردوں ، بہ یک واسطہ شاگردوں اور دو یا تین واسطوں سے شاگردوں کے کچھ نام اغصان الانساب کے مصنف نے گنائے ہیں ، مولوی حمد اللہ سندیلوی ، قاضی محمد نور الحق فتح پوری (ملا کمال کے ابن عم) مولوی محمد اعلم سندیلوی ، مولوی برکت الہ آبادی ، ملا حسن فرنگی محلی اور ان کے بھائی ملا محمد ولی فرنگی محلی (یہ دونوں فرنگی محلی حضرات ملا کمال کے سگے بھانجے بھی تھے) مولوی حمد اللہ خیر آبادی ، مولوی محمد احسن چریا کوٹی

(یہ سب براہ راست شاگرد)، ان حضرات کے وہ شاگرد جو صاحب درس ہوئے، مولوی باب اللہ جونپوری، مولوی غلام یحییٰ بہاری، مولوی عبد الواجد خیرآبادی وغیرہ ہیں، اور تین واسطوں سے شاگردوں میں مولوی فضل امام خیرآبادی، مولوی غلام امام شہید، مولوی عبد الواسع سیدن پوری، مولوی ضامن ساکن کرہ مانک پور وغیرہ، یہ سب مولوی عبد الواجد خیرآبادی کے شاگرد ہیں، اور مولوی عبد الواجد، مولوی محمد اعلم سندیلوی کے شاگرد اور بھانجے تھے، اور مولوی اعلم ملا کمال کے شاگرد رشید تھے، اس کے آگے صاحب اغصان الانساب لکھتے ہیں :-

و دیگراں را تا کجا برشمارم و آنہا کہ تدریس	کہاں تک نام گناؤں، وہ شاگرد جو صاحب علم
نکردند و صاحب علم بودند صدہا بودند	تھے مگر تدریس کا مشغلہ اختیار نہیں کیا،
پس از مولانا موصوف تا ایں زمان	سینکڑوں ہیں، ملا کمال الدین کے بعد سے
ہر کسی کہ مدرس ست خواہ فاضل از	اس وقت تک جو بھی صاحب درس ہے یا عالم
شاگردی جناب موصوف بیک واسطہ	فاضل ہے، ناممکن ہے کہ ایک یا دو یا تین یا
خواہ بدو واسطہ خواہ بسہ واسطہ	چار واسطوں سے ملا کمال الدین کے
و چہار واسطہ از تلمذ آں عالی جناب	دائرۂ تلمذ میں نہ آتا ہو، پورے ملک ہندوستان
ممکن نیست کہ بیروں آید و در تمام	میں جو بھی صاحب علم تھا یا ہے یا ہوگا، سبھوں کو
ملک ہندوستان ہر کسیکہ صاحب علم	بالواسطہ ملا کمال الدین سہالوی سے تلمذ
بودہ ہست و خواہد بود ہمہ را نسبت	اور آئندہ بھی ہوگا۔
تلمذ بواسطہا بآنجناب ہست و خواہد شد	(اغصان الانساب کا زمانۂ تصنیف ۱۲۶۰ھ ہے)

(اس وقت ملا کمال الدین کے وصال کو سو سال گزر چکے تھے)

مرزا قتیل نے بھی جن کی کتاب ہفت تماشا کا سنہ تصنیف ۱۲۲۶ھ ہے، اس وقت ملا نظام الدین کے وصال کو چھیاسٹھ برس، ملا کمال الدین کے وصال کو اکیاون برس اور بحر العلوم کی وفات کو صرف دو سال

گزرے تھے، ملا نظام الدین کے دو شاگردوں ملا کمال الدین سہالوی اور ملا بحر العلوم (فرزند ملا نظام الدین) کے کئی شاگردوں کے نام گنانے کے بعد تقریباً یہی لکھا ہے :-

ایں بزرگاں کہ شمار در آمدند شیخ سلسلۂ	یہ سب علما جن کا ذکر اوپر ہوا ہے (یعنی ملا
علما بودہ اند بجا بجا در ہند علم معقول	نظام الدین فرنگی محلی اور ان کے شاگرد ملا
از ہمینہا منتشر شدہ ہیچ فاضلے وطالبعلمے	کمال الدین سہالوی اور ان کے بلا واسطہ
نیست کہ از حلقۂ شاگردیِ اینہا بیروں باشد	تلامذہ نیز ملا بحر العلوم اور ان کے تلامذہ)
بعضے بشش واسطہ بعضے بہفت و بعضے	علما کے سلسلے کے شیخ و سرگروہ ہیں، ایک بھی
بکم ازیں در تلمذ علمی باینہا میرسند	عالم یا طالب علم ایسا نہیں ہو جو انکے شاگردوں
لیکن بعضے پنجابیاں و دہلویاں	کے حلقے سے باہر ہو، کوئی چھ واسطوں سے
	کوئی سات واسطوں سے اور کوئی اس سے کم
	واسطوں سے علمی شاگردی کے سلسلے میں ان ہی
	حضرات تک پہنچتا ہے، ہاں بعضے پنجابی اور
(ہفت تماشا)	دہلوی علما اس سلسلے سے باہر ہیں۔

دہلی اور پنجاب کے علما کے بارے میں بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ سب ہی خارج از سلسلہ ہوں، اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ نجیب الدولہ کے مدرسہ واقع دارانگر میں ملا کمال الدین سہالوی کے اجلہ تلامذہ ملا برکت الہ آبادی، ملا حسن فرنگی محلی اور ملا محمد سالم فتحپوری (فرزند دوم ملا کمال) مسند درس کو رونق بخش کر اطراف و جوانب کے طلبائے کثیر کو فیض پہنچا چکے ہیں، اور کچھ وقفے کے بعد مولوی فضل امام خیرآبادی نے جو تین واسطوں سے ملا کمال کے شاگرد تھے، دہلی میں سلسلۂ درس شروع کیا، ان کے نامور تلامذہ میں سے ایک مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ملا بحر العلوم (فرزند ملا نظام الدین) اور ملا حسن فرنگی محلی نے خاصے طویل عرصے تک رامپور میں درس و تدریس کی اور بڑی تعداد میں ان کے حلقۂ درس سے فضلاء و علماء نکلے، بہت وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں پنجابی اور دہلوی کتنے تھے لیکن اس سلسلۂ تلمذ سے پنجابیوں اور دہلویوں کو یکسر خارج سمجھنا خلاف مقتضائے احوال بھی ہوگا، اور بعض تاریخی صراحتوں کے بھی خلاف ہوگا، ملا نظام الدین کے تلامذہ میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے نام کا جزو دہلوی ہے، یعنی ملا وجیہ الدین دہلوی، جن کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر کا کہنا ہے کہ الشیخ العالم الکبیر وجیہ الدین الدھلوی احد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمۃ قرأ العلم علیٰ مولانا نظام الدین بن قطب الدین الکھنوی آگے صاحب نزہۃ الخواطر جو لکھتے ہیں وہ مرزا قتیل کے قیاس کو کمزور کرنے کے لیے کافی ہے، یعنی

ولی التدریس ببلدۃ دھلی	دہلی شہر میں درس و تدریس پر امور ہوئے
اخذ عنہ خلق کثیر	اور ان سے کثرت سے لوگوں نے علم حاصل کیا

تو اس "خلق کثیر" میں دہلی کے باشندے بالکل نہ ہوں، یہ بالکل خلاف قیاس ہے غرض دہلی کے لوگ بھی ملا وجیہ الدین دہلوی کی معرفت ملا نظام الدین کے سلسلۂ تلمذ میں بڑی تعداد میں "خلق کثیر" ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ملا وجیہ کے اور ان کے تلامذہ کے ذکر میں تساہل برتا یا سیاسی طور پر وہ ایسے نامور نہیں ہوئے کہ ان کی ایک ایک بات کی کھوج اس زمانے کا مورخ لگاتا، جب دلی کی تاریخ درباری سازشوں اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کی تاریخ بن چکی تھی، رسالہ قطبیہ کے مصنف ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی نے ملا وجیہ کے سلسلہ میں ایک اچھی نشاندہی کی ہے، وہ کہتے ہیں :-

راغب سوئے شعر بودند لہذا	ملا وجیہ شعر و شاعری کی طرف راغب
در علماء شمار کردہ شدند	تھے، اس لیے علماء کے زمرے میں انکا
	شمار نہیں کیا جاتا تھا۔

(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸) مشہور نقشبندی بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کو ان کی تشریف آوری معلوم ہوئی، اور جامع مسجد میں بحر العلوم کو تلاش کر کے ان سے ملاقات کی اور "مقام محمود" کی تشریح ان سے دریافت کی، بحر العلوم کا جواب سن کر مرزا صاحب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے، مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے اپنی تصنیف "ہدیہ مجیدیہ" کے حاشیے پر درج کیا ہے :-

چوں مولانا بحر العلوم لکھنوی بدہلی	جب مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، لکھنوی
تشریف فرما شدند بجامع مسجد شاہجہانی	دہلی میں تشریف فرما ہوئے، تو جامع مسجد
حضرت ایشان را دریافتہ از "مقام	شاہجہانی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں
محمود" پرسیدند در جواب حضرت	نے ان کو تلاش کر کے ملاقات کی اور ان سے
مرزا بہا لبتا تشہا کشادند	"مقام محمود" کے بارے میں پوچھا، جواب
(ہدیہ مجیدیہ مطبوعہ، ص ۳۳۲ حاشیہ)	سنکر مرزا صاحب نے تعریف و توصیف
	میں دیر تک گفتگو فرمائی۔

(حیاتِ شبلی)

حضرت عمرو بنؓ احمر الباہلی کا دیوان

(المتوفی نحو ۶۵ھ)

از جناب مولوی احمد خان صاحب ایم اے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی

حضرت عمرو بن احمر الباہلی رضی اللہ عنہ[۱] اہل وبر کے مخضرمی شاعر تھے، ان کی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت میں اور زیادہ حصہ اسلام میں گزرا ان کے نسب نامے میں کچھ اختلاف ہے،[۲] یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں رومیوں کے خلاف لڑے ہیں، ان ہی جنگوں میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، کبار صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی،

اسلام لانے کے بعد بہت سے اشعار کہے ہیں، خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت خالد ابن ولیدؓ کی بھی مدح کہی ہے، کسی سبب سے یزید بن معاویہ سے ناراض ہو گئے تھے، اس لیے اسکی ہجو لکھی،[۳] یزید نے پکڑ کر قتل کرنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ نہیں لگے، اور کہیں روپوش ہو گئے، اگرچہ ان کی پیدائش اور وفات کے سنین کا صحیح علم نہیں، مگر یہ معلوم ہے کہ یزید بن معاویہ (۶۰ھ۔ ۶۴ھ) کے عہد کے بعد وفات پائی اور نوے[۹۰] سال سے کچھ زائد عمر پائی، عبدالملک بن مروان (ابتدائے حکومت ۶۵ھ) کے عہد کے ابتدائی حصہ میں بقید حیات تھے، غالباً اسی بنا پر الزرکلی کا خیال ہے کہ ان کا انتقال ۶۵ھ کے لگ بھگ ہوا،[۴] مقام پیدائش اور مقام وفات بھی نامعلوم ہیں، مگر اتنا معلوم ہے کہ جزیرۃ العرب ہی میں

مقیم رہے ہیں[۵]

افسوس ہے کہ اس عظیم شاعر اور بطل جلیل کی زندگی کے حالات بہت کمیاب ہیں، ممکن ہے ان کے کلام کی مزید چھان بین سے ان کی حیات پر کچھ روشنی پڑ سکے وہ اپنے قبیلہ کے مشہور لوگوں اور جنگوں کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں،

فصاحت و بلاغت اور نئے الفاظ کی ایجاد

ابن احمر بڑے فصیح شاعر تھے، اجنبی اور شاذ (غریب) الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے، ان کی فصاحت، ناقدانِ شعرا اور لغویوں کے ہاں مسلم ہے،[۶] ابن جنی (۳۹۲ھ) نے اپنی کتاب الخصائص کے باب: فی الشئی یسمع من العربی الفصیح لا یسمع من غیرہ" میں ابن احمر الباہلی کے ارتجال اور فصاحت پر بڑی طویل بحث کی ہے، اس کے آخر میں فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں: فان الاعرابی اذا قویت فصاحتہ وسمت طبیعتہ تصرّف وارتجل مالم یسبقہ احد قبلہ بہ[۷]" اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن احمر میں فصاحت کا ملکہ اس قدر راسخ تھا کہ اس نے بہت سے الفاظ ارتجالاً اپنے اشعار میں استعمال کیے، جو بعد میں عربی زبان کے جزو لاینفک ہو گئے، اس طرح کا ارتجال العجاج (م ۹۰ھ) اور اس کے بیٹے رؤبہ (م ۱۴۵ھ) میں بھی تھا، ان کے اراجیز عربی زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں،

ابن احمر کے بارے میں ناقدین شعر کی آراء

اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ابن احمرؓ جاہلی عہد کے چند گنے ہوئے شعراء میں شمار ہوتے تھے، ابن حجر العسقلانی کہتے ہیں: کان من شعراء الجاہلیۃ المعدودین[۸]۔ ان کے کلام کی بلندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے اور امرؤ القیس کے اشعار میں ایک طبقے کے نزدیک خلط ملط ہو گیا ہے[۹]، یعنی دونوں کے شعری محاسن میں اس قدر مماثلت تھی کہ لوگوں کو ابن احمر اور امرؤ القیس کے اشعار میں تفریق کرنا دشوار ہو گیا،

المفضل الضبی (م ۱۶۸ھ) نے ابن احمر کا شمار بھی فحول شعراء میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں
ہؤلاء فحول شعراء اھل نجد الذین ذموا و مدحوا و ذھبوا فی الشعر کل مذھب[10]
اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ابن احمر نے مختلف اصناف میں جولانی طبع دکھائی ہے، ابو عبیدہ (م ۲۰۹ھ) نے ابن احمر الباہلی کو طبقۂ ثالثہ کے شعراء میں شمار کیا ہے[11]، الاصمعی (م ۲۱۶ھ) کی رائے ہے: لیس بفحل ولکنه دون ھؤلاء (الفحول) و فوق طبقته[12]۔ ابن سلام الجمحی (م ۲۳۲ھ) نے ان کو اسلامیین کے طبقۂ ثالثہ میں شمار کیا ہے[13]، الآمدی کی المؤتلف والمختلف کے حوالے سے ابن احمر کے بارہ میں ابن حبیب (م ۲۴۵ھ) کی یہ رائے ملتی ہے: کان یتقدم شعراء اھل زمانه۔ انھوں نے مشہور شعراء کے ساتھ ابن احمر کے مکمل حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر بحث میں اس کا نمونہ بھی دیا ہے[14]،

ابن احمر نے جو خود بھی اعلیٰ درجے کے ناقد شعر تھے، شعر کے بارے میں...... ایک رائے دی ہے، جو ایک لحاظ سے خود ان پر صادق آتی ہے، کیونکہ جب کوئی ناقد کسی شاعر کے بارے میں کوئی رائے دیتا ہے تو اس سے خود اس کے بارہ میں بھی رائے قائم ہوتی ہے، ابن احمر کی رائے میں "زھیر اشعر الناس" تھے[15]، زہیر کے بارے میں یہ رائے ابن احمر کے ذوق شعری کی دلیل ہے۔

ابن احمر الباہلی کا دیوان دوسری صدی ہجری میں جاہلی، مخضرمی اور اسلامی شعراء کے دواوین کو جن میں سے کچھ ابھی سینہ بسینہ چلے آ رہے تھے یا متفرق اجزاء میں موجود تھے، باقاعدہ مدون کیا جا رہا تھا[16]۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں ابن احمر کے کلام کا مجموعہ دیوان کی شکل میں موجود تھا، احمد بن علی بن احمد بن العباس النجاشی (م ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب الرجال میں یعقوب بن اسحاق ابن السکیت (م ۲۴۴ھ) کے تذکرے کے ضمن

میں اُن شعراء کے دواوین کا ذکر کیا ہے، جو ابن السکیت نے جمع کیے تھے، اس فہرست میں عمرو بن احمر الباہلی کا دیوان بھی شامل ہے[17]، اس لیے یہ بلا خوف و خطر کہا جا سکتا ہے کہ ابن احمر کا دیوان موجود تھا، اور بڑی حد تک سہل الحصول بھی تھا، کیونکہ متقدمین کے ہاں شواہد کے سلسلہ میں ابن احمر کے اشعار بکثرت ملتے ہیں، ان کے دیوان کا ذکر متعدد لغویوں نے کیا ہے، ان میں سے بعض ابن احمر کے دیوان کے مشکل کلمات اور نادر ترکیبوں کی تشریح کے لیے سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے، اور جو دیوان سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہو اس کی نقول بھی بکثرت ہو گئی، ابن احمر کے دیوان کی کثرت مزاولت سے اس کے کلمات اور الفاظ میں اختلاف بھی پیدا ہو گیا تھا، اس کی تصدیق ذیل کے واقعہ سے ہوتی ہے:

(قال ابوسعید العسکری) اخبرنی ابوذکوان، حدثنا موسی بن سعید بن مسلم قال: کان ابن الاعرابی یودبنا فدخل الاصمعی و نحن نقرأ شعر ابن احمر:

اغدواً واعد الحی الزیالا — لوجه لا نرید به بدالا

الی ان بلغنا الی قوله:

اری ذا شیبة حمال ثقل — وابیض مثل صدق السیف نالا

قال الاصمعی: "بالا" فصاح ابن الاعرابی: "نالا" بالنون من النوال ..... فحدثنی یموت بن المزرع عن ابی امامة الباھلی و حضر المجلس: ان الاعرابی انقطع بھذا، ثم احتال فاحضر نسخة فیھا شعر عمرو بن احمر وقد غیر البیت الاول منھا، فجعله:

اغدواً واعد الحی الزیالا — وشوقاً لا یبالی العیب بالا[18]

ابن احمر کے دیوان کا ایک نسخہ ابو الفتح عثمان بن جنی (م ۳۹۲ھ) کے پاس بھی موجود تھا۔

جس کا ذکر انھوں نے "الخصائص" میں کیا ہے، وہ ابن احمر کے دو اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولم یسند ابو زید ھذین البیتین الی ابن احمر ولا ھما ایضاً فی دیوانہ۔[19]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابن احمر کے دیوان کی نقلیں صرف ان ہی دونوں کے پاس تھیں، یہ بدیہی امر ہے کہ ابن احمر کا دیوان اتنا ہی عام تھا جتنے امرؤ القیس، الاعشیٰ، الاخطل اور دیگر شعراء کے دواوین۔ لیکن خوش قسمتی سے ان شعراء کے دواوین تو ہمیں دستیاب ہیں، مگر ابن احمر کا دیوان حوادث زمانہ کی نذر ہو گیا۔

علامہ الحسن بن محمد بن الحسن الصغانی (م ۶۶۵ھ) کی ان مؤلفات سے جو لغت پر مشتمل ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر دوسرے شعراء کے دواوین کے علاوہ ابن احمر کا دیوان بھی تھا۔ ان میں اس کے بکثرت اشعار نقل کیے ہیں، چنانچہ العباب الزاخر میں بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ اس میں ابن احمر کے ایسے اشعار بھی ہیں جو لغت و ادب کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔

ابن احمر کے دیوان کا سراغ مشہور مورخ مغلطائی بن قلیچ بن عبداللہ (م ۷۶۲ھ) کے ہاں بھی ملتا ہے، جیسا کہ البغدادی (م ۱۰۹۳ھ) کی کتاب خزانۃ الادب سے ظاہر ہے۔ بغدادی ابن احمر کے حالات کے ضمن میں ایک شعر کے بارے میں لکھتے ہیں: قال الحافظ مغلطائی فی حاشیۃ (الروض الباسم) علیہ (ای علی الروض الانف): وفیہ نظر من حیث ان الذی فی دیوان ابن احمر ان ذالک البیت بعد قولہ ......[20]

معلوم ہوتا ہے بغدادی نے بھی ابن احمر کے دیوان کے کئی نسخے دیکھے تھے، چنانچہ وہ ابن احمر کے ایک شعر کے پہلے مصرعہ "بتیھاء قفر والمطی کانھا" کی مختلف روایات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ھذا کلام من لم یقف علی الروایۃ والتی عامۃ نسخ شعرہ (ای ابن احمر)

ابا یعقوب سھیلا واسطی کا سناء[21]

ابن احمر کے دیوان کا ذکر مندرجۂ ذیل حضرات کے ہاں بھی موجود ہے:

(۱) محمد بن خیر الاشبیلی (م ۵۷۵ھ) فہرست ما رواہ عن شیوخہ، طبع بیروت ۱۹۶۳ء ص ۳۹۳-۳۹۷

(۲) حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ): کشف الظنون، طبع استنبول ۱۳۶۰ھ، ج ا ص ۷۷۳

(۳) السید الحسین العباسی النبھانی (م بعد ۱۰۹۵ھ)، فوٹو در ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ورق ۵۶

افسوس ہے کہ ہمارے اسلاف کے دوسرے نوادرات کے ساتھ ابن احمر کا دیوان بھی دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا: اور آج دنیا کے کسی کتب خانہ کی فہرست میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

ابن احمرؓ کے دیوان کی اہمیت | ابن احمر کے کلام کو حسب ذیل وجوہ سے خاص اہمیت حاصل ہے

(۱) وہ اس عہد کے شاعر ہیں جس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زندگی بسر کی ہے، اس لیے ان کے کلام سے اس عہد کے بارے میں بہت سی نئی معلومات منظر عام پر آئیں گی۔

(۲) قرآن کی زبان اور تراکیب کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے، ان میں اس عہد کے مروجہ کلمات کی تشریح اور خصوصی معانی پوری طرح محفوظ ہیں، اس لیے متقدمین نے فہم قرآن کے لیے جن شاعروں کے کلام کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے ان میں ..... عمرو بن احمر الباہلی بھی ہیں، چنانچہ تفسیر اور علوم القرآن سے متعلق کتابوں اور حدیث کی شرحوں میں ابن احمر کے کلام کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے، اور اس سے قرآن و حدیث کی زبان سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے، اس کے علاوہ اس میں اس عہد کی

رائج لفظی تراکیب، محاورات اور روزمرہ کا بڑا ذخیرہ ہے،

(۳) بعض اوقات شعراء کے دواوین میں ان کے عہد کے تاریخی واقعات کے متعلق ایسے اشارے مل جاتے ہیں، جس سے اس عہد کی تاریخیں خالی ہوتی ہیں، اس لیے بہت سے قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔

(۴) ابن احمر الباہلی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے عہد میں تھے، اس عہد کے بعض واقعات خود ان پر گزرے، بعض انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بہت سے مستند ذرائع سے سنے، اس کی تصویریں ان کے کلام میں ملتی ہیں، انھوں نے بہت سی لڑائیوں میں حصہ لیا، خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں روم کی معرکہ آرائیوں میں شامل رہے، ان کے کلام میں ان سب واقعات کا ذکر ہوگا، اس لیے ابن احمر کا دیوان تاریخ کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

(۵) ابن احمر نجد کے شاعر تھے، یہ وہ علاقہ ہے جس کی طرف آثار قدیمہ کے ماہرین نے کما حقہ توجہ نہیں کی ہے، اب رسالہ "العرب" کے مدیر اعلیٰ حمد الجاسر کی توجہ سے اس خطہ کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام شروع ہوا ہے، اس زمانہ میں نجد اور اس کے گرد و نواح میں بہت سی بستیاں تھیں جو اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں، بہت سے مقامات اور وادیوں کا اب پتہ نہیں چلتا، مگر عرب کے قدیمی لٹریچر میں ان کا ذکر موجود ہے، اس لٹریچر کا بڑا حصہ صرف شعروں کی شکل میں ہے، کیونکہ ان ہی وادیوں اور بستیوں میں اس علاقہ کے شعراء گھومتے پھرتے رہے ہیں، اس لیے ان نیست و نابود مقامات، وادیوں اور جگہوں کو صرف ان شاعروں کے کلام میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن احمر کا کلام نجد اور گرد و نواح کے مقامات کی تعیین کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، ان میں سے بعض مقامات کے محل وقوع کے سلسلے میں ابن احمر کا کلام بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے، چنانچہ قدیم جغرافیہ

نویسوں نے دوسرے شعراء کے علاوہ ابن احمر کے اشعار بھی بعض مقامات پر صرف بطور شواہد پیش کیے ہیں، بلکہ کچھ مقامات کی تعیین ابن احمر کے اشعار ہی سے کی ہے[22]،

(۶) اس عظیم شاعر نے، جو عموماً شاذ اور مشکل الفاظ استعمال کیا کرتا تھا، عربی کو بہت سے اچھوتے اور نئے الفاظ دیے ہیں، جن کا وجود اس سے پہلے کی عربی زبان میں نہیں ملتا، اس کا اعتراف متعدد لغویوں نے کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: "لا اعلم احدا اتی بھا الا ابن احمر الباہلی"[23]۔

(۷) ابن احمر اہل وبر کے شاعر تھے، اور ان کی زبان خالص عربی تھی، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا کلام جمع کر کے اسے محفوظ کیا جائے، جو عربی زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس اہم اور ضروری کام کو میں نے ۱۹۶۷ء میں استاد محترم اور عربی کے نامور عالم مولانا عبد العزیز المیمن کی نگرانی میں لاہور میں شروع کیا تھا، اب خدا کے فضل سے ابن احمر کے موجود اشعار کا مجموعہ ایک دیوان کی شکل میں جمع ہو چکا ہے۔ جو عنقریب چھپ جائیگا۔

ابن احمر کے اشعار جمع کرنے کا طریقہ

اشعار کے ضائع شدہ سرمایہ کو زندہ کرنے کی ایجاد کا سہرہ مولانا عبد العزیز المیمن کے ہی سر ہے، جنھوں نے سب سے پہلے اس کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

میں نے بھی ابن احمر کے اشعار مندرجہ ذیل قسم کی کتابوں سے جمع کیے ہیں، ان میں مطبوعہ کے علاوہ خطی کتب سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۱) عربی زبان کے لغات (۲) عربی ادب کی کتابیں (۳) عربی زبان، قواعد اور نقد کی کتابیں، تاریخی و جغرافیائی کتابیں جن میں شعری سرمایہ موجود ہے اور وہ قدیم بھی ہیں (۵) قرآن مجید کی تفاسیر، علوم القرآن، اور حدیث کی شرحوں پر مشتمل کتب (۶) عربی اشعار کے

مختلف مجموعے۔ (۷) مختلف شعراء کے دواوین کی شروح۔

ان کتابوں سے جمع شدہ اشعار کے ساتھ ان کی مختلف روایات کو بھی جمع کیا گیا ہے اور صحیح ترین روایت کو اصل قرار دے کر روایات کو حواشی میں درج کر دیا گیا ہے، مشکل الفاظ کی تشریح اور اس کے لیے جو شواہد میسر آسکے ہیں، جمع کیے گئے ہیں، اعلام کے تراجم اور جن واقعات کی طرف اشعار میں اشارہ ہے ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ ان اشعار کو جمع کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ شعر ابن احمر الباہلی ہی کے ہیں، جبکہ اس کے علاوہ اس نام کے تین اور شاعر بھی گذرے ہیں، ممکن ہے کہ ان کا کلام ہمارے عمرو بن احمر الباہلی کے ساتھ مل گیا ہو۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ سب سے پہلے ہم باقی تین شعراء کا جائزہ لیں گے، اس کے بعد آخر میں ان کے کلام کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جاسکے گا۔

الآمدی نے اپنی کتاب المؤتلف والمختلف[۲۴] میں چار ابن احمر نامی شعراء کا ذکر کیا ہے:

(۱) عمرو بن احمر بن العمرد الباہلی جن کا کلام ہم نے جمع کیا ہے (۲) ابن احمر البجلی: قدیم اسلامی شاعر (۳) ابن احمر الکنانی: اس کا نام ہنئی ہے اور جاہلی شاعر ہے (۴) ابن احمر الایادی

مؤخر الذکر تینوں شعراء کا ذکر ادب کی کتابوں میں ان کی نسبت کے ساتھ لیا جاتا ہے یعنی پہلے کو البجلی، دوسرے کو ہنئی ابن احمر الکنانی اور تیسرے کو الایادی، انکے برعکس عمرو بن احمر بن العمرد کا ابن احمر، عمرو ابن احمر، عمرو بن احمر الباہلی تینوں ناموں سے ذکر کیا جاتا ہے۔

مذکورہ تینوں شعراء کے کلام کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ ابن احمر الایادی کے ایک شعر کے علاوہ کوئی کلام نہیں ملا۔ الآمدی کہتے ہیں: لم یقع الی من شعرہ کبیر شئ وجدت لہ فی کتاب ایاد بیتاً واحداً وھو:

هل یهنئن عن نون و عن حمق ... من بالجزیرة من بدو و عمق

قبائلی شعراء کے مجموعے جن میں ان شعراء کا کلام جمع تھا۔ ان میں سے چند کا تو وجود ہی نہ تھا، جیسا کہ الآمدی نے قبیلہ ایاد کے متعلق لکھا ہے، اس کے علاوہ باقی دونوں شعراء کے کلام کے وجود سے تو کسی نے انکار نہیں کیا ہے، لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا، اور وہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا، یا وہ اتنا کم تھا کہ وہ مرور زمانہ کے ساتھ گم ہو گیا، صرف اس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

ابن احمر البجلی اور ہنئی بن احمر الکنانی کے ایک دو شعروں کا ذکر ابن منظور نے لسان العرب میں کیا ہے، مگر جہاں ان کے شعر دیے ہیں وہاں ان کے ناموں کے ساتھ البجلی اور الکنانی ضرور لکھا ہے، پھر چاروں شعراء کے زمانوں میں اتنا فرق ہے کہ اس سے ان کا طرز کلام بالکل ممیز ہو جاتا ہے، ابن احمر الباہلی کی مشکل تراکیب اور غریب کلمات میں دوسرے اشعار کے اختلاط کی بہت کم گنجائش ہے، مؤخر الذکر تینوں شعراء کے کلام کے وجود کی نفی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے دواوین کا کسی نے کہیں ذکر نہیں کیا ہے، ان کے مقابلہ میں ابن احمر الباہلی کے دیوان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

ابن احمر کے اشعار ابن احمر الباہلی اور کہیں کہیں عمرو بن احمر الباہلی کے نام سے مختلف کتب خانوں میں ہیں، ان وجوہ کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ جمع شدہ کلام صرف عمرو بن احمر ابن العمرد الباہلی کا ہی ہے۔

ابن احمر کے اشعار کا ضیاع ابن احمر پر گو اور کثیر الکلام نہ تھے، بلکہ کم کہتے تھے مگر اچھا کہتے تھے، اس کے باوجود لغت و ادب کی کتب میں شاذ کلمات کی بنا پر ان کے مختصر اشعار محفوظ ہو گئے ہیں۔

مگر ان اشعار کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا، جن میں غریب کلمات کا استعمال نہیں ہوا ہے، یا جو آسان تھے یا جن کا ذکر ایسی کتابوں میں آیا ہے جو اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں، اس لیے جو کچھ ہم نے جمع کیا ہے، یقیناً وہ ابن احمر کے کلام کا ایک حصہ ہے، باقی اشعار ضائع ہو چکے ہیں، اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ بعض قصائد کی ابتدا میں ہے: "من قصیدة له طویلة" مگر اس کے صرف چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، اسی طرح بعض قصائد کے صرف ایک دو شعر ملے ہیں، پورا قصیدہ نہیں مل سکا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن احمر کے کلام کا کتنا حصہ ضائع ہو گیا، پھر بھی اس مجموعے میں ساڑھے چھ سو کے قریب اشعار جمع کیے گئے ہیں، یہ مجموعہ عنقریب چھپ جائے گا۔

حواشی | [1] الف۔ الاصابہ فی تمییز الصحابة ط مطبعة مصطفیٰ محمد، القاهرة ج ۳ ص ۱۱۲ (توجہ ۷۸)

ب۔ المؤتلف والمختلف للآمدی ط القاهرة سنة ۱۳۵۴ھ ص ۳۷

ج۔ معجم الشعراء للمرزبانی ط القاهرة سنة ۱۳۵۴ھ ص ۲۱۴

د۔ الشعر والشعراء لابن قتیبة ط بیروت سنة ۱۹۶۴ء ص ۲۷۳

ه۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام ط دار المعارف بمصر سنة ۱۹۵۲ء ص ۴۹۲

و۔ فحولة الشعراء للاصمعی ط القاهرة سنة ۱۹۵۳ء ص ۲۳

ز۔ جمهرة اشعار العرب لابی زید القرشی ط بولاق سنة ۱۳۰۸ھ ص ۳۴-۳۵

ح۔ خزانة الادب لعبد القادر بن عمر البغدادی ط بولاق سنة ۱۲۹۹ھ ج ۳ ص ۳۸

ط۔ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفهانی ط دار الکتب المصریة ج ۸ ص ۲۳۴-۲۳۵

ی۔ الموشح فی مآخذ العلماء علی الشعراء للمرزبانی ط القاهرة سنة ۱۳۴۳ھ ص ۸۰

ک۔ سمط اللآلی شرح امالی القالی تحقیق عبد العزیز المیمنی ط القاهرة سنة ۱۹۳۶ء ص ۲۰۷

ل۔ الاعلام للزرکلی ط ثانیة ج ۵ ص ۲۳۷

[2] دیکھئے:- المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷، معجم الشعراء للمرزبانی ص ۲۱۴، الشعر والشعراء لابن قتیبة ص ۲۷۳؛ الاصابة ج ۳ ص ۱۱۲

[3] اس ہجو کے اس شعر کا ہمیں علم ہوا ہے (معجم ما استعجم للبکری ط القاهرة سنة ۱۹۴۵ء ص ۲۳۲):

اذا ما جعلت الستر بینی و بینه ‏ ‏ ‏ ‏ فلیس علی قتلی یزید بقادر

[4] الاعلام للزرکلی ج ۵ ص ۲۳۷، مصادر الشعر الجاهلی وقیمتها التاریخیة للدکتور ناصر الدین الاسد ط دار المعارف بمصر سنة ۱۹۶۶ء ص ۲۷۳؛ بحوالہ کتاب الاغانی ج ۸ ص ۲۳۴؛ ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے ابن احمر کو یہاں مشہور اور معمر شعراء کے زمرے میں بیان کیا ہے۔

[5] الزرکلی: الاعلام ج ۵ ص ۲۳۷

[6] طبقات فحول الشعراء لابن سلام ص ۴۹۲: المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷؛ الخصائص لابن جنی ط القاهرة سنة ۱۹۵۵ء ج ۲ ص ۲۱-۲۵؛ ان کے شاذ کلمات کا ذکر لغت و ادب کی متعدد کتابوں میں کئی مقامات پر آیا ہے: "لا اعلم احداً اتی بها الا ابن احمر الباهلی"۔

[7] الخصائص لابن جنی ج ۲ ص ۲۱ [8] الاصابة ج ۳ ص ۱۱۲

[9] ڈاکٹر ناصر الدین الاسد، امرؤ القیس کے دیوان پر بحث کے دوران اس کے نسخۂ یزیدی (ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن محمد بن یحییٰ بن المبارک الیزیدی المتوفی سنة ۳۱۰ھ) کے بارے میں ابن النحاس کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قال ابن درید: دفعها الاصمعی ورواها قوم لابن احمر، وهی فی اصل الیزیدی (مصادر الشعر الجاهلی ص ۴۹۹)، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے خاصے گروہ پر ابن احمر اور امرؤ القیس کے اشعار میں مماثلت کی بنا پر خلط مبحث ہو گیا تھا۔

[10] ص ۴۹۲ [11] جمهرة اشعار العرب ص ۳۵ [12] فحولة الشعراء للاصمعی ص ۲۳؛ الموشح للمرزبانی ص ۸۰ [13] طبقات فحول الشعراء

[14] المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷ والخزانة للبغدادی ج ۳ ص ۳۸، الآمدی

اور صاحب الخزانۃ نے ابن حبیب کی اس قسم کی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا، البتہ دوسرے مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ ابن حبیب کی ضائع شدہ کتابوں میں یہ دو کتابیں بھی ہیں جو شعراء کے حالات پر مشتمل تھیں، اب یہ کتابیں مفقود ہیں، ان میں سے کسی ایک میں ابن احمر کے مفصل حالات ہوں گے، وہ کتابیں یہ ہیں: (۱) کتاب اخبار الشعراء وطبقاتھم (۲) کتاب الشعراء والنابھم، دیکھئے المحبر لابن حبیب ط حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء ص ۵۱۵ - ۵۲۰ -

[15] جمہرۃ أشعار العرب ص ۳۴، المزھر للسیوطی ط مطبعۃ عیسیٰ البابی الحلبی بمصر ج ۲ ص ۱۹۱

[16] الآمدی (م ۳۷۰ھ) نے المؤتلف والمختلف میں ساٹھ مختلف قبائل کے دواوین کا ذکر کیا، اگرچہ ان میں اکثر کا وجود نہیں مل سکا، مگر جو مجموعے اس وقت موجود تھے ان میں سے بھی صرف اشعار ہذیل کے علاوہ چند قبائل کے شعراء کے دواوین ملے ہیں، بہرحال ان مجموعوں میں عمرو بن احمر الباہلی کے قبیلہ باہلہ کا ایک مجموعہ کتاب باہلہ کے نام سے بھی ملتا ہے، ممکن ہے اس میں ابن احمر کے اشعار بھی شامل ہوں، ان دواوین کے جامعین کے متعلق الآمدی نے کچھ نہیں بتایا، البتہ ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) نے کتاب الفہرست میں جن ۲۹ قبائل کے دواوین کا ذکر کیا ہے ان کے جامعین کا نام بھی دیا ہے مگر ابن ندیم کے یہاں اشعار یہ کتاب میں باہلہ کا ذکر نہیں ہے، دیکھئے مصادر الشعر الجاہلی ص ۵۴۳ - ۵۴۴

[17] احمد بن علی بن احمد بن العباس النجاشی: کتاب الرجال ط ایران (تاریخ طباعت درج نہیں) ص ۳۵۰

[18] ابو احمد الحسن بن عبداللہ بن سعید العسکری (۲۹۳ھ - ۳۸۲ھ) شرح ما یقع فیہ التصحیف والتحریف ط القاہرہ ۱۹۶۳ء ص ۱۵۲ - ۱۵۳ -

[19] الخصائص لابن جنی ج ۳ ص ۲۴، پتہ نہیں ابوزید الانصاری (م ۲۱۵ھ) نے کیوں ان دونوں شعروں کو ابن احمر کی طرف منسوب نہیں کیا، حالانکہ وہ دیوان میں موجود تھے، ابوزید القرشی (م ۱۷۰ھ) نے جمہرۃ اشعار العرب میں عمرو بن احمر الباہلی کے مشوبات کا انتخاب کیا ہے اور جس قصیدے کے یہ دونوں شعر ہیں، اس کو پورا نقل کیا ہے، چنانچہ ابن احمر کے اس مرثیہ میں سات اشعار کے بعد یہی دونوں شعر ہیں۔

اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ابن جنی بھی کہتے ہیں: ولا ھما ایضاً فی دیوانہ۔ غالباً ان دونوں کے پاس دیوان ابن احمر کے نسخے ناقص تھے، کیونکہ ان سے پہلے ابوزید القرشی ان اشعار کو پورے قصیدے کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کر چکے ہیں۔

[20] خزانۃ الادب للبغدادی ج ۳ ص ۳۸، الاعلام للزرکلی ج ۵ ص ۲۳۷ -

[21] خزانۃ الادب للبغدادی ج ۴ ص ۳۳ -

[22] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ البکری نے معجم ما استعجم میں ابن احمر کے اشعار کو ۴۶ مقامات پر مختلف مقاموں کی تعیین اور توصیف (Description) کے لیے درج کیا ہے، اس کام کے لیے یاقوت الحموی نے بھی معجم البلدان میں بہت سے اشعار نقل کیے ہیں، اس کے علاوہ لسان العرب، تاج العروس، تہذیب اللغۃ اور العباب جیسی لغت کی کتابوں میں ابن احمر کے بہت سے اشعار مقامات کی تعیین و توصیف کے لیے پیش کیے گئے ہیں -

[23] دیکھئے: الخصائص لابن جنی ج ۲ ص ۲۱، اصمعی نے توکیٔ کلمات کے لیے کہا ہے - لسان العرب میں کافی الفاظ ہیں جن کے ضمن میں یہ توصیفی کلمات آئے ہیں -

[24] المؤتلف والمختلف ص ۳۷

[25] ایضاً ص ۳۸

سیّد قادر میاں خوشتر احمد آبادی

اور

اس کا نایاب مرثیہ

از جناب محمد ایوب صاحب واقف ایم اے ریسرچ اسکالر اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی

بمبئی میں سید نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ اپنی بیش بہا کتابوں اور نادر مخطوطات کے لیے خاصا اہم تھا، بمبئی شہر اور دوسرے مقامات سے علم و ادب کے شائقین اس کتب خانہ سے استفادہ کے لیے اکثر آیا کرتے تھے، لیکن عمر کے آخری دنوں میں ان کی توجہ اور ان کا وہ ذوق جو اس لائبریری سے تھا، برقرار نہ رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتب خانہ کی بیشتر کتابیں ضائع ہوگئیں، جو بچ رہیں انھیں ندوی صاحب نے انتقال سے قبل انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو دیدیا، جہاں وہ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، یہ غالباً ان کے انتقال سے ایک ماہ قبل کی بات ہوگی، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے کتب خانہ کی تمام کتابیں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں جائیں گی تم ان کتابوں کو ترتیب سے رکھوا دو تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کل کتنی کتابیں ہیں اور کن کن موضوعات پر ہیں، میں نے ان کے حکم کی تعمیل شروع کر دی، اسی درمیان میں کتب خانہ کے ایک گوشے میں اینٹوں کی ڈھیر تلے کاغذات کا ایک ضخیم پلندہ ملا، احتیاطاً میں اسے بھی دیکھنے لگا، اس میں بہت سے اہم خطوط اور نظم و نثر کے کچھ مخطوطے ملے، میں نے اس کی اطلاع ندوی صاحب کو دی تو وہ سنکر

ایسے خوش ہوئے جیسے انھیں کوئی متاع گراں مایہ ہاتھ لگ گئی ہو کہنے لگے ان مکاتیب و مخطوطات کو میں ایک عرصہ سے تلاش کر رہا تھا لیکن مل نہیں رہے تھے، انھوں نے انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بعض خطوط و مخطوطات تو ایسے ہیں جنھیں حاصل کرنے میں انھیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے، لیکن جس مقصد کے تحت انھوں نے ان کو حاصل کیا تھا، اب وہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا، میں نے اس کی وجہ دریافت کی کہنے لگے اب تو ہاتھ میں قلم پکڑنے کی طاقت رہی اور نہ آنکھوں میں روشنی، میں نے عرض کیا حضور آپ نے ایسے ایسے باکمال شاگرد پیدا کیے ہیں جو آپ کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پورا کر سکتے ہیں، آپ اتنا بد دل کیوں ہوتے ہیں، خود آپ کے رفیق کار عبدالرزاق قریشی صاحب تصنیفی و تالیفی کام میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، اس پر انھوں نے فرمایا "بیچارہ قریشی تو کام کر ہی رہا ہے میں تو ان نوجوانوں سے کام لینا چاہتا تھا جن سے مستقبل کی بہت سی توقعات ہم نے وابستہ کر رکھی ہیں، لیکن آج کل کے نوجوانوں کے ذوق اور رجحان کو دیکھکر بڑی مایوسی ہوتی ہے" میں نے ندوی صاحب سے مودبانہ درخواست کی کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے اس سلسلے میں کام لیں۔ انشاء اللہ میں آپ کی نگرانی میں حتی الوسع اس اہم کام کو ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کروں گا، اس پر ندوی صاحب نے خوشی و طمانیت کا اظہار کیا اور اسی وقت مجھے مکاتیب و مخطوطات کے اس پلندے سے احمد آباد کے ایک گمنام شاعر سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ مرحمت فرمایا، اور خوشتر کے حالات تلاش کرنے میں امداد کا وعدہ بھی کیا، مگر افسوس کہ اس کے ایک ماہ بعد ہی استاد محترم اس دار فانی سے کوچ کر گئے،

ندوی صاحب نے مجھے جو غیر مطبوعہ مرثیہ عنایت فرمایا تھا وہ سید قادر میاں خوشتر

احمد آبادی کا ہے، خوشتر تخلص کے احمد آباد میں ایک عہد میں تین شاعر ہوئے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: سید برہان الدین خوشتر عرف میران صاحب، یہ احمد آباد کے قصبہ دہیو کے رہنے والے تھے، ان کا آبائی پیشہ پیری مریدی تھا، ان کے آباء و اجداد نے راجہ بڑودہ کے یہاں ملازمت اختیار کی تھی، دوسرے سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی ہیں، تیسرے خوشتر کا پورا نام نہیں دریافت ہو سکا، ان کے بارے میں مصنف مخزن الشعراء نے لکھا ہے کہ یہ بواہیر قوم سے تعلق رکھتے تھے، سالہا سال تک بنگالہ، اودھ اور صوبہ بہار میں بسر اوقات کیے، خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ سے ان کے مراسم تھے،

راقم الحروف نے جو مرثیہ حاصل کیا ہے اس کے شروع میں تخلص کے ساتھ پورا نام سید قادر میاں لکھا ہوا ہے، اس لیے اس مرثیہ کے اصل مصنف کے بارہ میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا، اب رہا سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے حالات زندگی کی فراہمی تو حتی الوسع میں نے گجرات کے قدیم شعراء و صوفیاء سے متعلق تذکروں کا مطالعہ کیا، لیکن بدقسمتی سے مخزن الشعراء کے علاوہ کسی کتاب میں خوشتر کے بارہ میں کچھ نہ مل سکا، گجرات کے بہت سے اصحاب سے خط و کتابت کی لیکن وہ بھی میری مدد سے قاصر رہے، حیدرآباد سے محمد اکبرالدین صدیقی اور ناگپور سے ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی صاحب نے خوشتر سے متعلق جو معلومات بھیجے وہ مخزن الشعراء ہی سے ماخوذ تھیں، مجھے سید ظہیرالدین مدنی صاحب کا تحقیقی مقالہ "سخنوران گجرات" جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا، پڑھکر تعجب ہوا، انھوں نے گجرات کے متعدد شعراء کے صرف نام گنا دیے ہیں، ان شعراء کے متعلق تسلی بخش مواد فراہم نہ کر سکے پرانے تذکروں میں جو کچھ مل گیا، اسی پر قناعت کر لی، مدنی صاحب گجرات ہی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لیے سہولتیں بھی تھیں، وہ چاہتے تو بیشتر شعراء کے

خاندانی حالات فراہم کر سکتے تھے، ان کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے، مدنی صاحب اشاعت سے قبل اگر اس کمی کو پورا کر دیں تو یہ کتاب گجرات کے شعرا اور وہاں کی اردو شاعری کی عہد بہ عہد کی ترقی پر ایک گرانقدر تصنیف ہوگی۔

مخزن الشعراء جس میں سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے حالات درج ہیں، اس کے مصنف قاضی نورالدین حسین خاں فائق نے اس میں کل ایک سو چودہ [۱۱۴] شاعروں کا ذکر کیا ہے، اس کے دیباچے میں اس تذکرہ کے بارہ میں لکھا ہے:

"ایں اوراق خزینہ از جواہر زر معانی سخنوران در رغرر خوش بیانی
نکتہ پروران است موسوم بہ مخزن الشعراء شد"

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس تذکرہ میں مستند اور قادرالکلام شعراء ہی کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا اہم تذکرہ مرتب کرتے وقت قاضی نورالدین فائق جیسے بلند پایہ تذکرہ نگار نے جن کی قابلیت اور فنی شعور کی تعریف غالب جیسے شاعر نے کی، شاعروں کے حالات زندگی، ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں کو پردہ اخفا میں کیوں رکھا، حالانکہ اس تذکرہ کے بیشتر شاعر مصنف کے معاصر تھے، اور بہتوں سے تو ان کے مراسم بھی تھے، بہر حال مخزن الشعراء میں فائق نے خوشتر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں ہم ان کے حالات زندگی اور ان کے عہد کا تعین کریں گے، فائق نے سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے متعلق یہ چند سطور قلمبند کی ہیں:

"خوشتر تخلص، سید قادر میاں نبیرۂ سید مہدی صاحب مرحوم کہ اوصاف جمیلۂ
ایشان مشہور است طبع رساں ذہن ذکا مید اد و در فارسی و عربی استعداد

معقول وہم علم فرائض بخوبی مستحضر دارد و در رفتار و گفتار، بطرز نوجنیان درست
وخوب است چوں معاشِ مشائخین بر خدمت مریداں سورت می بند د لہذا
اقامتش گاہے در سورت و گاہے در احمد آباد از راقم تعارف باحسن وجہ
جاری است"۔

اس سے خوشتر احمد آبادی سے متعلق بہت سی باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے، اول یہ کہ
وہ سید مہدی کے پوتے یا نواسے تھے، محترم اکبرالدین صاحب صدیقی مدیر "سب رس" حیدرآباد
نے مجھے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ خوشتر سید مہدی کے فرزند تھے، جو صحیح نہیں ہے، مؤلف
مخزن الشعرا نے انھیں نبیرۂ سید مہدی لکھا ہے، نبیرہ کے معنی پوتا یا نواسہ ہوتے ہیں، فرزند
نہیں، اس کی تصدیق علی جواد زیدی اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی وغیرہ نے بھی اپنے
خطوط میں جو انھوں نے مجھے لکھے ہیں، کی ہے، اس لیے خوشتر سید مہدی کے پوتے یا نواسے
تھے، دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ صوفی مسلک رکھتے تھے، اور چونکہ تذکرہ نویس
نے خصوصیت کے ساتھ ان کے دادا سید مہدی کا نام لیا ہے، اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ
ان سے پہلے بھی ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا، وہ علم فرائض کے ماہر تھے،
کبھی احمد آباد میں قیام کرتے تھے اور کبھی سورت میں، ان مقامات پر ان کے مریدوں
کی کثیر تعداد تھی۔

سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے عہد کے متعلق اگرچہ اس تذکرہ میں کوئی
تصریح نہیں ہے، لیکن مصنف نے لکھا ہے کہ "از راقم تعارف باحسن وجہ جاری است"
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشتر اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت بقیہ حیات تھے، اور
ڈاکٹر مولوی عبدالحق جنھوں نے اس تذکرہ کو اپنے جامع مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے،

نورالدین فائق کو مرزا غالب کا معاصر بتایا ہے، اور اس کے ثبوت میں انھوں نے تذکرہ
کے اخیر میں قاضی صاحب کے نام مرزا غالب کا ایک خط بھی شائع کیا ہے، یہ خط دوشنبہ
جولائی ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے، اور غالب نے یہ خط اس موقع پر لکھا تھا جب فائق
نے تذکرہ لکھنے کے بعد اس کو ان کے پاس اصلاح و مشورہ کے لیے بھیجا تھا، وہ خط حسب ذیل ہے:-

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نورالدین حسین خاں بہادر کی خدمت میں

عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا مجھکو
دیے، نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی، کامل صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے اسکو
بھی نہیں دیکھا، صرف آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپکے بعض جا درست
کر دیا، بعض موقع پر منشائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے، مجھکو یہ یارا نہیں کہ آپ کی
نثر میں دخل کروں، بفحوائے الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں، مرحبا آفریں
بجا خوب نثر لکھی ہے، اللہ سبحانہ آپ کو مدارج اعلیٰ کو پہنچائے اور سلامت رکھے۔

خوشنودی احباب کا طالب

غالب

غالب کا سنہ پیدائش ۱۷۹۷ء اور سنہ وفات ۱۸۶۹ء ہے، نورالدین فائق کا سنہ ولادت
تو دستیاب نہیں ہو سکا، لیکن سنہ وفات مولوی عبدالحق نے ۱۸۶۹ء لکھا ہے، اس طرح
غالب اور فائق دونوں نے ایک ہی سال میں انتقال کیا، فائق نے چونکہ خوشتر احمد آبادی
کے متعلق لکھا ہے کہ ان سے خوشتر کے تعلقات قائم تھے، اس بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ بھی
کہہ سکتے ہیں کہ غالب اور فائق کا زمانہ ہی خوشتر کا بھی زمانہ ہے، تذکرہ مخزن الشعرا کی ترتیب
کی تاریخ کے متعلق اس تذکرہ کے آخر میں بہت سے قطعات درج ہیں، جن میں اس تذکرہ کا

سنہ تصنیف ۱۲۸۰ھ نکلتا ہے، مثلاً ایک قطعہ یہ ہے:

چونکہ فایق بنام این مخزن
بست مملو ز لولوے لالا

طمع غیب گفت تاریخش
خوش کتاب است مخزن الشعرا
سنہ ۱۲۸۰ھ

مرزا فایق کے انتقال اور اس تذکرہ کی تالیف میں اٹھارہ سال کا فرق ہے، اس لیے بعید نہیں کہ خوشتر احمد آبادی نے بھی اسی سنہ کے قریب کسی سال میں وفات پائی جس سال میں غالب اور فائق نے انتقال کیا۔

خوشتر سے متعلق اس سے زیادہ حالات نہیں ملتے، اب غیر مطبوعہ مرثیہ ملاحظہ ہو:-

جو دل سے جان نثار پیغمبر خدا ہے
اے مجرئی وہ بیشک مقبول کبریا ہے

جو غم گزیر شاہ مظلوم کربلا ہے
حق اس سے راضی اور خوش سلطان انبیا ہے

ہے نور چشم احمد شبیر اس کی الفت
نور صراط ہے اور ایمان کا ضیا ہے

جس کے قدم سے تسکیں عرش عظیم پائے
کاندھے پہ اس نبی کے شبیر جا چڑھا ہے

اعمیٰ بھی جانتا ہے آل نبی کا رتبہ
روح الامیں کو پوچھو اس کا پتہ چلا ہے

عیسیٰ اتر فلک سے مہدی کا مقتدی ہے
مریمؑ سے فوق کتنا رتبہ بتولؑ کا ہے

آنکھوں سے ہاتھ دھوئے رو رو کے دیکھو آخر
غم اک پسر کا ایسا یعقوبؑ کو ہوا ہے

گر پاؤں ہاتھ آویں شبیر کے تو دھوویں
پانی بنیں ہم اپنی چشموں سے یہ دعا ہے

احباب اقربا و فرزند تشنہ لب سب
سوئے عدن سدھارے پر اف نہیں کیا ہے

منظور حق یہ تھا کہ وہ تشنہ کام آئے
آنسو تک اس نے بھی پر ہرگز نہیں پیا ہے

فرمائے ملکہ ان کی وہ لاش دیکھ بے سر
سر دے کے تم کیا سر تم نے مرا خدا ہے

اب کوئی دم جو زندہ ہوں میں بھی پھر کسی کی
ہے تیغ آبدار اور سوکھا مرا گلا ہے

بن پانی جان اصغر یوں آرہی ہے لب تک
پانی پہ جوں حباب اور اس میں ذرا ہوا ہے

کر صبر آبروئے شبیر بتول رکھ دے
پھر تیغ حیدری کا پانی دکھا دیا ہے

وہ برق دش جدھر جا کوندی ادھر سروں کی
یکسر جھڑی لگی جوں ساون برس رہا ہے

خون تشنگان خون سلطان تشنہ لب کا
ایسا پیا کہ اٹکا دم اس کا بھر گیا ہے

قطع کلام کاٹے سایہ تک اشقیا کے
کیا سیف مرتضیٰ نے لوہا منا دیا ہے

جو بھاگے وہ تھے باقی اور حکم حق یہ پہنچا
شبیر اب وفا کر وعدہ جو کچھ کیا ہے

کرمیان تیغ بولے تیغ آزمائی تھی یہ
ورنہ وفائے وعدہ تو اصل مدعا ہے

ذلت شامیوں سے بن آئی اب تمھاری
مت بھاگو آؤ لو سر خالق کی یوں رضا ہے

ہر صبح و شام ہر دم درگاہ کبریا سے
یہ مقصد و تمنا یہ عرض و التجا ہے

خوشتر کے عقدے مشکل کل حل ہوں یا الٰہی
یہ بھی غلام آل و اصحاب مصطفٰے ہے

دیگر

اے مجرئی کونین کا مختار ہے شبیرؑ
اور ناز الوہیت دادار ہے شبیرؑ

جس در کا گدا کشور عرفاں کا شہنشاہ
درباں ہیں ملک جسکے وہ سالار ہے شبیرؑ

اعدا کو دیا آب نہ کی آپ کی کچھ فکر
کیا بحر کرم ابر عطا بار ہے شبیرؑ

جب خیمہ زن خلد ہوئے غازی تو شامی
کہنے لگے اب بیکس و بے یار ہے شبیرؑ

ہر ایک ہوا لاف زن حوصلۂ رزم
یہ جان کے بے طاقت و ناچار ہے شبیرؑ

کہتا تھا کوئی دیکھ لو کچھ اسکے بھی جوہر
پھر دم میں ابھی جوہر تلوار ہے شبیرؑ

اکبر کے تو مرنے نے اسے مار رکھا پر
عباس کے غم سے بھی دل افگار ہے شبیرؑ

کہتا تھا کوئی جائے ترحم ہے عزیزو
ہر گونہ اذیت میں گرفتار ہے شبیرؑ

گر قبضۂ اعدا میں تھا دریا کا کنارا
کوثر کا مگر ساقی و مختار ہے شبیرؑ

خوشترؔ ترا آقا ترا والی ترا مولیٰ
سبطِ نبی و سید ابرار ہے شبیرؑ

گم اختر فیروز سکندر تو نہیں ہے
پر شہ کی سلامی کا وہ ہمسر تو نہیں ہے

روشن ہے ضیا بخش جہاں مہر ہے لیکن
جوں عارضِ شبیر منور تو نہیں ہے

خوشبو میں اگر مشک ہوا شہرۂ آفاق
پر کاکلِ اکبر سا معطر تو نہیں ہے

اکبر ہے نہالِ چمنستانِ امامت
پھولا نہ پھلا کیوں وہ صنوبر تو نہیں ہے

والب تھے اور اصغر نے رکھا منہ میں
چلا کے کہا بانو نے محور تو نہیں ہے

مد الفِ قامت شہ تیغ عدو ہو
یہ خارجِ ارقامِ مقدر تو نہیں ہے

صاد اس نے کیا فردِ شہادت پہ بہ بالیقین
اب زیر و زبر کچھ کرے باور تو نہیں ہے

جوں نوکِ قلم ورنہ صفیں صفا ہی کٹ جائیں
شمشیرِ علی سطرِ مکرر تو نہیں ہے

تیغ ایک طرف ابرو کا اشارہ ہو تو دیکھو
لاشیں پڑی یکسر ہیں یہ کیسر تو نہیں ہے

سو جان سے ہو جاؤں میں شبیرؑ پہ قرباں
کوئی اس سے مراد اور مجھے خوشترؔ تو نہیں ہے

سلامی آوے پسند اس کو یاسمن کی بو
جو سونگھے خواب میں گاہ رخِ حسن کی بو

عرق سے اسکے کہاں عطرِ گل کو نسبت
ہے اسکے خوں میں تو محبوبِ ذوالمنن کی بو

وہ بے بہا گلِ وحدت اس کے مہکتی ہو
زمین تخت قدم گلشنِ عدن کی بو

جو عندلیب کا ہو دشتِ کربلا میں گذر
ہو قبول دماغ اس کو پھر چمن کی بو

گئے جو خلد میں اکبر تو رو کے زہرا نے
جبیں کو چوم کے لی زلفِ پرشکن کی بو

سکینہ بولی ہے اصغر کے غم سے غش ماں کو
سنگھاؤ اسکو کوئی اس کے پیرہن کی بو

کہا یوں شاہ سے ہمشیر نے کہ سونگھوں گی
ہیں کس کے جسم سے مادر کے ابلبن کی بو

کہا یوں لاشۂ اصغر پہ رو کے بانو نے
سنگھا گئیں صدقہ ذرا غنچۂ دہن کی بو

گئی نہ خنجرِ قاتل سے ایک مدت تک
وہ خونِ تشنۂ مظلومِ بے وطن کی بو

مہک رہی ہے گلستانِ دہر میں ہر سو
ہر ایک گلِ سخن مدحِ پنجتن کی بو

جو ہوتے والبِ رنگیں تو لب سے جھڑتے پھول
مہکتی بزم میں عطرِ گلِ سخن کی بو

لے پروں پہ عرق جس کا اپنے روح القدس
غریب ایسے کے ہو شمر سگ بدن کی بو

کہاں نصیب وہ خوشترؔ کہ ہو نصیب تجھے
شمیم مرقدِ پاک شہِ زمن کی بو

ادبیات

رفتارِ زمانہ بہ ترجمانیٔ استاد غالبؔ

بمناسبت تقریب جشنِ صدسالہ غالبؔ

از پروفیسر نکہت شاہجہانپوری

پیرِ مغاں کا جشن برنگِ دگر ہے آج
ہر موجِ بادہ حاصلِ خونِ جگر ہے آج

سرمستی و نشاط کو اب ڈھونڈیے کہاں
ساقی کی چشمِ مست مگر بے اثر ہے آج

زاغ و زغن کے دور میں بلبل ہے بے نوا
ہر گوشۂ چمن ہمہ تن شور و شر ہے آج

دنیائے نو کو حسنِ تمدن سے بیر ہے
تہذیب مثلِ طائرِ بے بال و پر ہے آج

خوش فہمیاں ہیں دامنِ فردا لیے ہوئے
ہر رشتۂ امید فریبِ نظر ہے آج

اب کس پہ اعتبار زمانے میں کیجئے
واللہ راہزن ہی مگر راہبر ہے آج

اے ہم سفر نہ پوچھ غمِ دل کی داستاں
خود مقصدِ حیات ہی زیر و زبر ہے آج

یہ انقلابِ نو کی نہ تمہید ہو کہیں
کچھ تیز تر سی گردشِ شام و سحر ہے آج

اے منزلِ حیات کے رہرو سنبھل کے چل
ہر گام رہگذار بہت پر خطر ہے آج

غالب کی اشکبار سی آنکھیں ہیں منتظر
بربادیٔ ہنر ہی متاعِ ہنر ہے آج

وہ نکتہ سنج و نکتہ شناس و سخن طراز
دیوان جس کا معدنِ لعل و گہر ہے آج

تھی جس کی "سجدہ گہ" درِ ادراک سے پرے
اس کا مزار قبلۂ اہلِ نظر ہے آج

ہاں ہاں! وہی جو بادہ و ساغر کے ساتھ تھے
خود "لذتِ شہود" سے بھی بہرہ ور ہے آج

مائل تھا جو نہ طاعت و زہد و ثواب پر
توبہ ہیں اس کی رحمتِ حق مستتر ہے آج

جو آبروئے اہلِ نظر کا تھا پاسباں
خود آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر ہے آج

غالب نواز کاشکہ اردو نواز ہوں
"غالب محل" نسلِ "فکر و نظر" ہے آج

سر پھوڑنے کو مل تو گیا کوئی آستاں
یوں بھی تو سنگ و خشت ہی بس جلوہ گر ہے آج

اردو ادب کو از سرِ نو زندہ کیجئے
غالب خود آپ کے لیے پیغامبر ہے آج

کل تک چراغِ دیر بھی شاید ہی جل سکے
شمعِ حرم برنگِ چراغِ سحر ہے آج

نکہت بہارِ گلشنِ اردو اداس ہے
ذوقِ ادب شہیدِ غمِ بال و پر ہے آج

غزل

از جناب رزم ردولوی

مرے ہوش و صبر و قرارِ دل شبِ انتظار چلے گئے
مرے حالِ غیر سے اوب کر مرے غمگسار چلے گئے

مری آن جان سے عزیز تھی ترے وضعدار چلے گئے
ترا نام لیکے پکارتے سرِ عرش دار چلے گئے

مرے دل کی بات تری زباں مرا حرفِ شوق ترا بیاں
یہ قرینہ میل ملاپ کے کہاں میرے یار چلے گئے

یہ شباب اور یہ زندگی یہ غم و نشاط کے معرکہ
نہ پلٹ کے آئیں گے پھر کبھی اگر ایک بار چلے گئے

یہی داغِ دل یہی زخمِ تن جو وفا کے باغ و بہار ہیں
یہی ہار پھول لیے ہوئے وہ حضورِ یار چلے گئے

جنہیں دستِ ظلم نے کھو دیا جنہیں تہمتوں نے چھپا دیا
جنہیں ڈھونڈتی پھریں تہمتیں وہ گناہگار چلے گئے

نہ قدم رکے رہِ تیغ پر نہ جھکایا سر کبھی دار پر
تری بات پر تری ذات پر کیے اعتبار چلے گئے

نئی بات کیا ہے بدل گئے رخ وہی جنگ ہوش و جنوں کی ہے
نہ تو رست دستِ جفا پڑا نہ وفا شعار چلے گئے

جو سزا وفا کی لکھی گئی خطِ تیغ سے سر و سینہ پر
یہی عرضداشت سنبھال کے سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ ملال ہجر نہ اشکِ غم نہ خلش نہ رشک نہ وسوسہ
ترے آتے ہی دل و ذہن سبھی اختیار چلے گئے

غزل

از جناب پروفیسر افتخار احمد صاحب فخرؔ دھولپوری، ایم اے

گلشن بلا سے زد پہ ہے برق و شرار کی
لیکن چمن میں دھوم ہے جشنِ بہار کی

ساقی! سنا نوید نہ فصلِ بہار کی
تشنہ ہے روح جبکہ ہر اک بادہ خوار کی

ماہ و نجوم و کہکشاں بھی ہیں گردِ راہ
پرواز سوئے عرش ہے مشتِ غبار کی

ہمت شکن تھی منزلِ دشوارِ عاشقی
اہلِ ہوس نے راہ فرار اختیار کی

یہ کونسا مقام ہے اے جوششِ جنوں
دامن کی ہے خبر نہ گریباں کے تار کی

پھرتی ہے لے کے گردشِ دوراں مجھے کہاں
آخر یہ جستجو ہے، تجھے کس دیار کی

گلشن میں کھل رہے ہیں شگوفے نئے نئے
بعدِ خزاں ہوئی ہے جو آمد بہار کی

دامن میں کتنے پھول ہیں اے چشمِ خونفشاں
درکار دل کو سیر تھی کب لالہ زار کی

کچھ مسکراؤ تا کہ مہک جائیں زخمِ دل
رہ جائے میرے دل میں نہ حسرت بہار کی

ہنستے ہیں ہر غرور کا نیچا ہوا ہے سر
کرنا نہ فخرؔ بات کبھی افتخار کی

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر مظہری جلد ہفتم ۔ تالیف مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ ترجمہ مولانا سید عبدالدائم الجلالی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۵۶، قیمت غیر مجلد ۱۳ پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

ندوۃ المصنفین دہلی نے بیہقیٔ ہند قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مشہور تفسیر مظہری کے اردو ترجمہ کی اب ساتویں جلد شائع کی ہے، جو سورۂ بنی اسرائیل تا سورۂ طٰہٰ کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس سے قبل پانچویں اور چھٹی جلدوں کا ان صفحات میں تذکرہ کیا جا چکا ہے، ان جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی مصنف نے آیات کی تشریح و تفسیر کے علاوہ کہیں کہیں کلامی فقہی، تاریخی، نحوی اور لغوی مسائل سے بحث کی ہے، لائق مترجم نے جن کو خود بھی فن تفسیر کا ذوق ہے، سلیس، رواں اور معنی خیز ترجمہ کیا ہے، لیکن یہ تفسیر قدیم طرز کی ہے، اس لیے ظاہر ہے موجودہ زمانہ کے مسائل و رجحانات کا اس میں لحاظ نہیں ہے، تاہم اس ترجمہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، اور جو . . . قرآن مجید کے مطالعہ کا شغف رکھنے والے اردو خواں اصحاب کو موجودہ دور تفسیروں کے ساتھ اس تفسیر کو بھی اپنے مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

تذکرہ روضۃ السلاطین و جواہر العجائب } تصحیح و تحشیہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب، بڑی تقطیع کاغذ معمولی، خوبصورت ٹائپ، مجلد، صفحات ۲۲۴ قیمت عہ

پتہ: ادبی سندھی بورڈ، حیدرآباد سندھ، پاکستان۔

پاکستان کے مشہور مصنف اور نامور فاضل سید حسام الدین راشدی صاحب کو علمی و تحقیقی کاموں خصوصاً قدیم و نایاب مخطوطات کو ایڈٹ کرنے میں بڑی مہارت ہے، وہ ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں، اور اب انھوں نے دسویں صدی ہجری کے ایک صاحب کمال مصنف و شاعر سلطان محمد فخری کے دو تذکرے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب اور دیوان ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، پہلے تذکرہ میں ان سلاطین و امرا کے حالات ہیں جنھوں نے فارسی یا ترکی زبان میں شاعری کی ہے، اس تذکرہ کو ابھی تک فخری کے بجائے دوسرے مصنف کی تصنیف خیال کیا جاتا تھا اور غیر مطبوعہ تھا، اس کے جن پانچ قلمی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے، ان میں سے اکثر سے لائق مرتب نے تصحیح کے دوران مدد لی ہے، دوسرے تذکرہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جنھوں نے فارسی زبان میں شعر کہے ہیں، یہ تذکرہ دوبار نولکشور پریس لکھنؤ اور سہ ماہی رسالہ اردو اورنگ آباد کے جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں حکیم سید شمس اللہ قادری کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ چھپ چکا ہے، لیکن راشدی صاحب نے اس کو مطبوعہ اور قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر بڑے اہتمام اور مزید صحت کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ دونوں تذکرے گو مختصر اور زیادہ پر از معلومات نہیں لیکن اپنی منفرد نوعیت اور مختلف وجہوں سے بڑے اہم ہیں، پہلے سے کئی امرا و سلاطین کی شعر گوئی کا علم ہوتا ہے اور دوسرے میں متعدد ایسی شاعرہ خواتین کا ذکر ہے جن کے ذکر سے دوسری کتابیں خالی ہیں،

فخری کا دیوان نایاب ہے، راشدی صاحب نے اس کی بعض کتابوں سے ایک سو ایک غزلیں جمع کرکے تذکروں کے آخر میں شامل کر دی ہیں، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مبسوط اور پر مغز مقدمہ اور آخر میں مفصل تعلیقات بھی ہیں، مقدمہ میں بڑی تلاش و تحقیق سے فخری کے حالات و واقعات، اس کے سندھ آنے اور یہاں کے امرا و سلاطین سے توسل اور اس زمانہ کے سندھ

کے سیاسی و معاشرتی حالات اور فخری کی تصنیفات کے متعلق مفصل معلومات اور اس کے اور اس کی تصنیفات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، تعلیقات میں ان اشخاص و مقامات کے متعلق ضروری معلومات دیے گئے ہیں، جن کے نام متن میں آئے ہیں، آخر میں اشخاص، اماکن اور کتب کا مکمل اشاریہ ہے، فاضل مرتب کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتابیں بھی ان کی تلاش و تحقیق، حسن ترتیب اور حسن مذاق کا نمونہ ہیں، اور وہ اس مفید علمی خدمت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تاریخ کوکن - مرتبہ ڈاکٹر مومن محی الدین ایم اے، پی ایچ ڈی (ڈبلن) متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۹۳ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲/

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳

یہ کتاب دکن کے مغربی ساحلی علاقہ کوکن کی اشوک کے دور سے لیکر شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ تک کی سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ اور پندرہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے تین ابواب میں کوکن کی قدیم تاریخ، اس زمانہ کے راجاؤں کے واقعات اور سیاسی و تمدنی حالات ہیں، پھر مسلمانوں کی آمد اور اس زمانہ کی نو مسلم قوموں اور بیرونی ملکوں کے نوآباد مسلمانوں کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں اس دور کی کوکن کی علمی و دینی حالت اور زبان وغیرہ کا ذکر بھی ہے، پھر خلجی، تغلق اور بہمنی حکومتوں کی شکست و ریخت، مسلم عہد حکومت کے زرعی حالات، طرز معاشرت، اسلامی تہذیب و ثقافت کے خصوصیات و اثرات اور کوکن کے مختلف حصوں کے لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور بول چال کا فرق دکھایا گیا ہے، چند ابواب میں پرتگیزیوں اور فرانسیسیوں کے کوکن پر تسلط، استبداد اور مظالم کی داستان اور مغلوں اور مرہٹوں کی معرکہ آرائیوں اور انگریزوں

کے ہندوستان پر ابتداءً قبضہ کرنے کی روداد بیان کی گئی ہے، آخر کے دو ابواب میں کوکن کے بعض مشہور اشخاص اور اہم مقامات کا تذکرہ ہے، یہ کتاب اگرچہ محنت سے لکھی گئی ہے اور کوکن کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف نے اس میں لفاظی اور انشاپردازی کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ تاریخی اور تحقیقی کتابوں کے لیے موزوں نہیں ہے، کہیں کہیں لسانی حیثیت سے بعض غلطیاں بھی ہیں، مثلاً "صنادید کوکن" کے زیر عنوان کوکن کی مشہور عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اس کو "آثار صنادید کوکن" ہونا چاہیے تھا، "مشاہیر کوکن" کے زیر عنوان صرف شیواجی اور نواب معتبر خاں کا ذکر ہے، شیواجی اور مرہٹوں کی مدح سرائی اور مغلوں کی بربریت و سفاکی اور عالمگیر کی مذہبی عصبیت اور سخت گیری وغیرہ کے ذکر میں مصنف کا قلم جابجا حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔

بنگال کا اردو ادب :- مرتبہ پروفیسر جاوید نہال صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۶۰ مجلد مع گردپوش، قیمت عـــہ، ناشر اردو رائٹرس گلڈ ۱/۱۸ فیرس لین، اسرار منزل کلکتہ ۱۲۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بنگال بھی اردو زبان کے فیض و اثر سے محروم نہیں ہے، انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں وہ تنہا حکومت ہی کا نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کا بھی مرکز تھا، اور اردو میں سلیس نثر نگاری کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام ہی سے ہوئی، لیکن ابھی تک بنگال کی ان ادبی و لسانی خدمات کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی، اور نہ فورٹ ولیم کالج ہی کے متعلق کوئی مستقل کتاب موجود تھی، زیر نظر کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن اس میں صرف مغربی بنگال کے انیسویں صدی میں ادبی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اس لیے اس کا زیادہ حصہ فورٹ ولیم کالج

کے حالات و خدمات پر مشتمل ہے، اس میں کالج کی مختصر تاریخ، اس کی اہمیت اور اس سے وابستہ یورپین اور ہندوستانی مصنفین و مترجمین کے علاوہ ان مصنفین کے حالات، ادبی کمالات اور تصنیفات وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو کالج کے ملازم تو نہ تھے مگر انھوں نے بھی انعام حاصل کرنے کے لیے کتابیں تصنیف یا ترجمہ کی تھیں، آخر میں بنگال کے بعض ادبی مرکزوں مرشد آباد، ہوگلی، سیرام پور، مٹیا برج اور کلکتہ کی ادبی سرگرمیوں، مصنفوں اور شاعروں کے حالات اور ادبی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، شروع میں بنگال میں اردو زبان کی ابتدا اور عہد بعہد ارتقا کا مختصر تذکرہ اور اسی ضمن میں بنگال کی سیاسی، تاریخی اور اخلاقی حالت اور بنگالی زبان کے متعلق بھی مفید معلومات دیے گئے ہیں، لیکن مصنف بعض تفصیل و تحقیق طلب مقامات سے بہت سرسری گذر گئے ہیں، اور کتابوں کے تعارف و تبصرے میں ان کی خامیوں سے بہت کم بحث کی ہے، تاہم کتاب چھان بین اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہے، اور وہ اردو زبان کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

نجوم رسالت حصہ اول - مرتبہ ڈاکٹر علیم الدین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۲۰۰، قیمت عـہ، پتے: (۱) مکتبہ اسلامی ادب للہ پورہ (فاطمان) بنارس (۲) ڈاکٹر علیم الدین [illegible]

چند سال پہلے بنارس میں بزم سیرت صحابہ کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی تھی، اس میں مختلف اصحاب شعر و سخن نے رسالت کے محرمان خاص کی بارگاہ میں نذرانۂ خلوص و عقیدت پیش کیا تھا، یہ گلدستۂ اشعار نعتیہ بزم مشاعرہ کے قصائد، نعت و منقبت سے سجایا گیا، اور شمع رسالت کے چالیس جاں نثار پروانوں کے منظوم فضائل و مناقب پر مشتمل ہے، گو فنی حیثیت سے یہ قصائد زیادہ بلند نہیں ہیں اور اکثر شعرا غیر معروف ہیں تاہم ان میں صحابہ کرام اور صحابیات کے فضائل پرخلوص اور معتدل انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اور ان سے ان کی سیرت و کردار کے بعض دلکش پہلو سامنے آتے ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے۔

قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات بالترتیب ۳۰ مجلد ۱۰۲، غیر مجلد قیمت ہر دو حصہ عام پتہ: (۱) مسلمانوں کا سوشلسٹ سینٹر ڈی ۱۹۸۔ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۳ (۲) رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۰۰۷، ۱۸، کلاں محل، دہلی ۶۔

پہلا کتابچہ لائق مرتب اور ظفر امام صاحب کے دو فکر انگیز مقالوں اور دوسرا سولہ اصحاب علم و قلم کی ان تقریروں پر مشتمل ہے، جو نومبر ۶۸ء میں دہلی کے ایک سیمینار میں کی گئی تھیں، پہلے میں ہندوستان کے قومی کلچر کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے رول کا ذکر ہے، اور دوسرے میں اسی موضوع کے بارہ میں مولانا ابو الکلام مرحوم کے نقطۂ نظر کی مقررین نے توضیح کی ہے، دونوں کتابچوں میں مجموعی حیثیت سے معتدل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، تاہم بعض باتیں کھٹکتی ہیں، دوسرے کتابچہ میں فاضل مرتب نے موجودہ مسلم قیادت اور جماعتوں کا دلچسپ اور معبر انہ تجزیہ کیا ہے لیکن مضمون کے آخر میں غیر معتدل باتیں بھی آگئی ہیں۔

صحرا میں اذان - از جناب گوپال متل صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ خوبصورت سرورق صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ے ر پتہ: مکتبہ تحریک ۹ر انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶ر

جناب گوپال متل اڈیٹر تحریک اردو کے مشہور صاحب قلم اور مشاق شاعر ہیں، یہ انکا نیا مجموعۂ کلام ہے، کمیونزم دشمنی انکا خاص مسلک ہے، اس مجموعہ میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے، موجودہ حالات سے وہ بددل ہیں اور انھوں نے صحرا میں اذان دینے کی کوشش کی ہے، انکو اصل مناسبت غزل سے ہے، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، اور انھوں نے غزل کے روایتی اسلوب و انداز کو اپنے مخصوص رنگ اور نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اس مجموعہ میں آزاد اور پابند نظمیں بھی ہیں، اور ان سے بھی شاعر کی فن پر قدرت، جذبات و احساسات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے متل صاحب کی شاعری کیفیت، جدت ادا، جوش بیان، طنز، وظرافت اور فکر و خیال کی رعنائی و تازگی سے معمور ہے، اور اس مجموعہ کی ظاہری صورت بھی نہایت پُرکشش اور جاذب نظر ہے۔ "ض"

جلد ۱۰۶ ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات